بسم اللہ الرحمن الرحیم

پروفیسر ظفر احمد☆

فکر ونظر کی مستحکم بنیادیں

بحوالہ کتاب اللہ واصحاب رسول اللہ ﷺ

﴿دوسری قسط﴾

(۵) مقامِ خلفائے راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین

(الف) بحوالہ غزوۂ تبوک وآیتِ غار (مقام ابوبکر صدیقؓ):-

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں روم وایران کی حکومتیں نہایت طاقتور تھیں جنھیں اس دور کی دو عالمی قوتیں (World Pawers) کہا جاسکتا ہے۔ ۹ ہجری میں پیش آنے والے غزوۂ تبوک میں مقابلہ رومی حکومت سے تھا۔ مزید برآں طویل سفر، سخت گرمی اور کھجوروں کی پختہ فصل نے اہل حق کی آزمائشوں میں شدت پیدا کردی تھی۔ منافقین کا نفاق تو طشت از بام ہونا ہی تھا۔ بعض مخلص مسلمان بھی اس غزوے میں شرکت سے گھبرا رہے تھے۔ چونکہ ان کی اصلاح اور تربیت مقصود تھی، انہیں شرمندہ کرنا اور بدنام کرنا مطلوب نہ تھا لہٰذا اللہ تعالیٰ نے عتاب آمیز لہجے میں صرف انہی حضرات کو مخاطب نہیں فرمایا بلکہ خطاب کو عام رکھا حالانکہ اس پر سب کا اتفاق ہے کہ سارے کے سارے اصحاب رسول جہاد سے جی چرانے والے ہرگز نہ تھے۔ چنانچہ سورۂ توبہ کی متعلقہ آیات کا مضمون یہ ہے کہ جب تمہیں قتال فی سبیل اللہ کے لئے کہا جاتا ہے تو تمہیں کیا ہو جاتا ہے کہ تم زمین میں گڑے جاتے ہو آخر میں فرمایا کہ اگر تم جہاد کے لئے نہ نکلے تو اللہ تعالیٰ تمہیں عذاب دے گا اور تمہاری بجائے کوئی اور قوم لے آئے گا وَيَسْتَبْدِلْ قَوْماً غَيْرَكُمْ (۱)۔ چونکہ خطاب عام تھا اسلئے متعلقہ حضرات کی اصلاح طلب بشری کمزوریوں اور کوتاہیوں پر ستار العیوب اللہ

☆ سابق صدر شعبہ علوم اسلامیہ گورنمنٹ ایس، ای کالج بہاولپور

تعالیٰ نے نہ صرف پردہ ڈال دیا بلکہ ان کی اصلاح بھی اس طرح فرمائی کہ ان کوتاہیوں کے حامل افراد ظاہر نہ ہونے پائیں اور ان کا مقام ومرتبہ بھی بحال رہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ ان اصحاب رسول کی جگہ کوئی اور قوم نہیں لایا۔ ان کی اصلاح نہ ہوئی ہوتی تو اللہ تعالیٰ یقیناً اپنی خبر کو سچا کرتا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات میں غزوۂ تبوک آخری غزوہ ہے اور قتال فی سبیل اللہ کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ کا یہ عتاب آمیز خطاب بھی آخری خطاب ہے۔ اس عتاب آمیز خطاب سے رسول اللہ ﷺ کے صرف ایک صحابی سیدنا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو مستثنیٰ رکھا گیا ہے۔ جس سے صدیق اکبر کا انتہائی بلند مقام ومرتبہ بخوبی واضح ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثَانِيَ اثْنَيْنِ اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلَيْهِ وَاَيَّدَهٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰى وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ○ (۲) ''یعنی اگر تم اس (رسول) کی مدد نہیں کرو گے تو بے شک اللہ نے اسکی مدد کی تھی جب اسے کافروں نے (مکے سے) نکال دیا تھا وہ دو میں دوسرا تھا جب وہ دونوں غار میں تھے جب وہ اپنے ساتھی (ابوبکرؓ) سے کہہ رہا تھا تو رنج نہ کر بے شک اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ تو اللہ نے اس پر اپنا سکینہ (اطمینان) نازل کیا اور اس کی مدد (ملائکہ کی) ایسی فوجوں سے کی جنہیں تم نے نہیں دیکھا اور اس نے کافروں کی بات کو نیچا کر دکھایا اور اللہ کی بات ہی اوپر رہی۔ اور اللہ (بڑا) زبردست ہے (اور) حکمت والا ہے (کہ جس طرح اور جس کے ذریعہ چاہے اپنے رسول کی مدد کرے)''

یہاں درج ذیل امور بالخصوص قابل توجہ ہیں:-

(۱) مذکورہ بالا آیت میں رسول اکرم ﷺ کے کلمات لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا (اے ابوبکرؓ) تو رنج نہ کر اللہ ہمارے ساتھ ہے'' سے ثابت ہوا کہ جو معیت الٰہیہ رسول اکرم کو حاصل ہے اسی میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کو بھی حصہ عطا ہوا ہے کیونکہ آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ ان اللہ معی ومعک (بیشک اللہ میرے اور تیرے ساتھ ہے) بلکہ یہ فرمایا ہے کہ اللہ ہمارے ساتھ ہے یعنی ہم دونوں کے ساتھ ہے۔ یہ فضیلت کسی اور صحابی رسول کے لئے کتاب اللہ سے ثابت نہیں۔ کوئی نعمت دو یا دو سے زائد اشخاص میں مشترک ہو تو اس سے ان کے مدارج ومراتب کا یکساں ہونا لازم نہیں آتا۔ بالفاظ دیگر اشتراک نعمت سے مساوات ثابت نہیں ہوتی لہذا یہ شبہ باطل ہے کہ پھر تو حضرت ابوبکر صدیقؓ (معاذ اللہ) رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر ہو گئے۔ دیکھئے نبوت اللہ تعالیٰ کی وہبی نعمت ہے اور وصف نبوت تمام انبیاء علیہم السلام میں گو مشترک ہے لیکن ان کے مدارج ومراتب کم وبیش ہیں۔ تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ

عَلٰی بَعْض (۳) یعنی ان رسولوں میں سے ہم نے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے''۔ دیگر حضرات انبیاء علیہم السلام، رسول اکرم ﷺ کے ساتھ کے وصفِ نبوت اور وصف معیت الٰہیہ دونوں میں شریک ہیں جبکہ حضرت ابوبکر صدیقؓ آپ کے ساتھ وصفِ معیّتِ الٰہیہ میں شریک ہیں۔ لیکن یہ نبیوں والی خاص معیت الٰہیہ ایسی زبردست نعمت ہے جس میں حضرات انبیا علیہم السلام کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ کا کوئی اور شریک نہیں لہٰذا حضرت ابوبکر صدیقؓ نبیوں والی ولایت کے بعد نہایت بلند مرتبۂ ولایت پر قائم ہیں یعنی آپ مقام صدیقیت پر فائز ہیں بلکہ مدارج صدیقیت میں آپ صدیقیت کبریٰ پر قائم ہیں ورنہ رسول اکرم ﷺ کے تو سب ہی اصحاب مرتبہ صدیقیت یا کم از کم مرتبہ شہادت پر فائز ہیں چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ''وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّیْقُوْنَ وَالشُّهَدَآءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ'' (۴) ''یعنی جو لوگ اللہ پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے وہ اپنے رب کے ہاں صدیقین اور شہداء ہیں''۔ ظاہر ہے کہ آیت کے نزول کے موقع پر روئے زمین پر صرف اصحاب محمد ﷺ ہی تو مومنین تھے اور وہی اس کا اولیں مصداق ہیں۔

(۲) آیت غار میں جس معیت الٰہیہ کی بات ہو رہی ہے یہ خاص معیتِ رحمت وقرب ہے ورنہ اللہ تعالیٰ کی معیتِ عامہ جسے معیتِ علم بھی کہا جا سکتا ہے، وہ تو ہر شخص بلکہ ہر چیز کو حاصل ہے یعنی اللہ تعالیٰ کا علم ہر چیز کو محیط ہے۔ وَهُوَ مَعَكُمْ اَیْنَ مَا كُنْتُمْ (۵) ''تم جہاں بھی ہو گے اللہ تمہارے ساتھ ہے''۔ وَهُوَ مَعَهُمْ اِذْ یُبَیِّتُوْنَ مَا لَا یَرْضٰی مِنَ الْقَوْلِ (۶) ''وہ (اللہ) ان (منافقین) کے ساتھ ہوتا ہے جب وہ رات کے وقت ناگفتنی مشورے اور سازشیں کر رہے ہوتے ہیں''۔

اللہ تعالیٰ کی خاص معیتِ رحمت کے مستحق صرف متقی اور نیک لوگ ہوتے ہیں مثلاً اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِیْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ (۷) ''اللہ ان لوگوں کے ساتھ ہے جو پرہیزگار رہے اور جو نیکوکار رہیں''۔ اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِیْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِیْنَ (۸) ''بے شک اللہ کی رحمت نیک لوگوں کے قریب (ساتھ ہے)''۔ آیت غار میں تو عام متقین ہی کی نہیں بلکہ پیغمبروں کے درجے کی خاص معیتِ رحمت مذکور ہے۔ اگر یہاں محض اللہ تعالیٰ کی معیت علم ہی مراد ہو تو رسول اکرم ﷺ کا بطور بشارت یہ فرمانا کہ اللہ ہمارے ساتھ ہے (معاذ اللہ) بیکار ہوگا۔ اللہ کی یہ معیت عامہ اور معیتِ علم تو سب کو حاصل ہے اس میں رسول اکرم ﷺ اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی کیا خصوصیت رہی؟

(۳) بعض اوقات واحد کے لئے جمع کی ضمیر بطور تعظیم استعمال ہوتی ہے مثلاً اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (۹) ''ہم نے ہی اس نصیحت (قرآن کریم) کو

اتارا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں''۔ آیت میں صیغہ جمع کا لایا گیا ہے چونکہ ایک سے زائد خداؤں کا وجود محالاتِ عقلیہ سے ہے لہذا آیت میں واحد اور لاشریک اللہ تعالیٰ ہی مراد ہے۔ لیکن آیت غار میں ''اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا'' میں ''معنا'' سے واحد متکلم یعنی صرف رسول اکرم ﷺ کو مرادِ کلام ٹھہرانے پر گز ہرگز کوئی قرینہ موجود نہیں کیونکہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کو اس معیت الٰہیہ سے خارج کرنے پر یہ شقیں پیدا ہونگی کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ یا تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خیر خواہ تھے یا (معاذ اللہ) بدخواہ تھے یا آپ رسول اکرم ﷺ کی خیر خواہی یا بدخواہی سے بے نیاز ہو کر معاذ اللہ محض اپنی ہی جان کی فکر میں پریشان اور رنجیدہ تھے۔ اگر حضرت ابوبکرؓ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خیر خواہ اور ہمدرد تھے تو انہیں معیت الٰہیہ سے خارج کرنے کا کوئی عقلی جواز ہی نہیں۔ اگر آپ (معاذ اللہ) بدخواہ تھے تو رسول اکرم ﷺ کا آپ کو لاتحزن (تو رنج نہ کر) کے کلمات سے مخاطب کرنا بے معنی قرار پائے گا۔ منافقین اصحاب رسول اللہ ﷺ کے بدخواہ اور دشمن تھے، سامنے آتے تو اپنا مومن ہونا ظاہر کرتے اور تنہائی میں ہوتے تو صحابہ کرامؓ سے بغض وعناد کی بنا پر اپنی انگلیاں غصے سے کاٹتے۔ اللہ تعالیٰ نے رسول اکرم ﷺ کو حکم دیا کہ آپ ان کے لئے یوں بددعا کریں۔ مُوْتُوْا بِغَیْظِکُمْ (۱۰) ''یعنی تم اپنے غصے میں مرجاؤ انہیں لاتحزنوا (تم رنج نہ کرو) سے مخاطب نہیں کیا گیا۔ اگر مذکورہ بالا تینوں شقوں میں سے تیسری شق اختیار کی جائے کہ حضرت ابوبکرؓ کو معاذ اللہ رسول اکرم ﷺ کی کوئی فکر نہ تھی بلکہ اپنی ہی فکر میں مبتلا تھے تو رسول اکرم ﷺ آپ کو ''لاتحزن ان اللہ معنا (تو رنج نہ کر اللہ ہمارے ساتھ ہے) نہ کہتے یہاں کوئی ڈانٹ ڈپٹ اور تنبیہ کا لفظ مثلاً کلّا بمعنیٰ خبردار! (حرف ردع) استعمال کرتے اور ''معنا کی بجائے'' معی'' کہتے تاکہ کوئی ابہام نہ رہتا۔ جب فرعون اور اس کے لشکر نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور آپ کے ساتھیوں (بنی اسرائیل) کا تعاقب کیا کہ آگے سمندر اور پیچھے فرعون تھا تو انہوں نے اپنی ہی جانوں کی فکر میں کہا۔ فَلَمَّا تَرَآءَ الْجَمْعٰنِ قَالَ اَصْحٰبُ مُوْسٰٓی اِنَّا لَمُدْرَکُوْنَ (۱۱) جب دونوں جماعتوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تو موسیٰ کے ساتھیوں نے کہا ہم تو پکڑے گئے''۔ اس پر حضرت موسیٰؑ نے جواب دیا۔ کَلَّا اِنَّ مَعِیَ رَبِّیْ سَیَھْدِیْنِ (۱۲) ''یعنی خبردار! بے شک میرا رب میرے ساتھ ہے وہ مجھے عنقریب راہ دکھائے گا''۔ جب آخری دونوں شقیں باطل ہوگئیں تو پہلی شق ہی صحیح ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے خیر خواہ، ہمدرد اور دوست تھے۔ پس آیت میں ''معنا'' جمع کی ضمیر کا مرجع رسول اکرم ﷺ اور حضرت ابوبکر صدیقؓ دونوں ہیں۔ پس رسول اکرم ﷺ کی مکمل رضامندی سے حضرت ابوبکر صدیقؓ آپ کے رفیقِ سفر اور یارِ غار بنے ورنہ ہمارے امامیہ بھائیوں کے نزدیک رسول اکرم ﷺ عالم الغیب بھی تھے آپ ہر

گز اس سمت کا رخ نہ فرماتے جہاں راستے میں آپ کا سامنا حضرت ابوبکر صدیقؓ سے ہوتا چنانچہ تاریخی روایات کے مطابق رسول اکرم نے خود حضرت ابوبکر صدیقؓ کو ساتھ لیا تھا۔ اگر یہ کہا جائے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ رسول اکرم ﷺ کے مخلص اور خیر خواہ ساتھی تو تھے لیکن (معاذ اللہ) مومن نہ تھے اس لئے ''معنا'' میں ضمیر جمع متکلم کے مرجع میں شامل نہیں ہیں تو مہاجرین مکہ بشمول حضرت ابوبکر صدیقؓ اور انصارِ مدینہ کا قرآن کریم کی رو سے مومن کامل ہونا اور مغفور و مرحوم ہونا مقالہ ہذا کے پہلے حصے میں ہم بخوبی واضح کر چکے ہیں لہذا یہ شق بھی باطل ہے۔

(۴) کوہِ طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دیگر دعاؤں کے علاوہ یہ دعا بھی کی تھی کہ اے اللہ! میرے بھائی ہارون کو بھی میرے ساتھ کر دیجئے تا کہ وہ میرے شریک کار ہوں اور مجھے ان سے تقویت ملے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ قَدْ اُوْتِیْتَ سُئْلَکَ یٰمُوْسٰی (۱۳) ''اے موسیٰ! تجھے تیری مانگی چیز مل گئی''۔ ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا کا مقصد یہ تھا کہ حضرت ہارون علیہ السلام ان کے لئے ''یارِ خاطر'' بنیں نہ کہ (معاذ اللہ) ''بارِ خاطر'' ثابت ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے دعا قبول فرمائی تو یقیناً یہ ماننا پڑے گا کہ حضرت ہارون علیہ السلام بلاشبہ اپنے بھائی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے ''یارِ خاطر'' ہی ثابت ہوئے حالانکہ قرآن کریم سے مثلاً سورہ طٰہٰ سے ثابت ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے ان دونوں حضرات کو فرعون کے پاس جا کر تبلیغ حق کا حکم دیا تو دونوں نے یہ کہا۔ اِنَّنَا نَخَافُ اَنْ یَّفْرُطَ عَلَیْنَآ اَوْ اَنْ یَّطْغٰی (۱۴) ''یعنی ہم دونوں کو ڈر لگتا ہے کہ کہیں وہ (فرعون) ہم پر زیادتی نہ کرے یا سرکشی نہ کرے'' اس سے معلوم ہوا کہ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام دونوں اپنی اپنی جگہ پر خائف تھے۔ بعد کے سلسلۂ واقعات میں جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کوہ طور پر تورات لینے گئے اور اپنے پیچھے اپنی قوم بنی اسرائیل پر حضرت ہارون علیہ السلام کو بطور نگہبان چھوڑ گئے تو حضرت موسیٰؑ کی عدم موجودگی میں قوم میں سے ایک گروہ نے بچھڑے کی پوجا شروع کر دی تھی۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کوہِ طور سے واپس آئے تو سخت غصے کی حالت میں تھے۔ آپ نے اپنے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کو سر اور داڑھی سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا کیونکہ آپ کو یہ خیال ہوا کہ حضرت ہارون علیہ السلام نے گوسالہ پرستی کرنے والوں کے مواخذے و محاسبے میں شاید کوتاہی برتی ہے۔ اس پر حضرت ہارونؑ نے یہ کہا کہ اے میری ماں کے بیٹے یعنی اے میرے حقیقی بھائی! میری داڑھی اور سر نہ پکڑ مجھے تو یہ خدشہ ہے کہ آپ یہ بھی کہہ دیں گے کہ تو نے بنی اسرائیل میں تفریق ڈال دی ہے اور میری بات کا خیال نہیں رکھا (۱۵)۔ اب اگر کوئی شخص حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کے ان واقعات سے یہ نتیجہ اخذ کرے کہ حضرت ہارونؑ نے مصائب و

مشکلات میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو سہارا تو نہیں دیا بلکہ وہ خود فرعون سے خائف تھے اور قوم کی گوسالہ پرستی کے معاملے میں تو حضرت موسیٰ کو ناراض ورنجیدہ ہونا پڑا۔ لہذا حضرت ہارون علیہ السلام (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے بارِ خاطر نہیں بلکہ بارِ خاطر ثابت ہوئے، تو اس طرح کا نتیجہ اخذ کرنے والا شخص یقیناً گمراہی میں مبتلا ہے۔ ادھر غار ثور میں کوئی ایسی صورتِ حال سرے سے پیش نہ آئی کہ رسول اکرم ﷺ کو حضرت ابوبکر صدیقؓ سے ناراضگی کا اظہار کرنا پڑا ہو۔ جہاں تک حضرت ابوبکرؓ کے حزن (رنج وغم) کا تعلق ہے تو آپ رسول اکرم ﷺ کے لئے پریشان تھے کیونکہ قریش مکہ کا اصل نشانہ اور ہدف رسولِ اکرمؐ ہی تھے لیکن اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ حضرت ابوبکرؓ کو اپنی ذات کے لئے پریشانی لاحق تھی تو بھی یہ نتیجہ ہرگز اخذ نہیں کیا جاسکتا کہ آپ (معاذ اللہ) رسول اکرم صلی اللہ وسلم علیہ وسلم کے لئے ''بارِ خاطر'' نہیں بلکہ ''بارِ خاطر'' ثابت ہوئے ورنہ اس طرح کا الزام حضرت ہارون علیہ السلام پر تو (معاذ اللہ) کہیں زیادہ عائد ہوگا جو بذات خود بھی فرعون سے خوف زدہ تھے اور قوم کی گوسالہ پرستی کے واقعے میں تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان سے اپنی رنجش کا برملا اظہار فرمایا تھا۔ یہاں یہ کہنا کافی نہ ہوگا کہ بعد میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے استغفار کرلیا تھا کیونکہ انہوں نے صرف اپنی لئے ہی نہیں بلکہ اپنی بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کے لئے بھی کیا کہ ہم دونوں میں سے جس سے بھی اجتہادی خطا سرزد ہوئی ہے اللہ اسے معاف کردے۔ پس جب فرعون سے خوف زدہ ہونے اور بعد میں گوسالہ پرستی کے معاملے میں ممکنہ خطائے اجتہادی میں مبتلا ہونے کے باوجود یہ کہنا سراسر گمراہی ہے کہ حضرت ہارون علیہ السلام اپنے بھائی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے بارِ خاطر ثابت ہوئے تو حضرت ابوبکرؓ کے متعلق اس طرح کی رائے قائم کرنا بھی گمراہی ہے کیونکہ حضرت ابوبکر کا نہ تو اپنی ذات کے لئے خوف زدہ یا رنجیدہ ہونا قطعیت سے ثابت ہے اور نہ ہی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم آپ سے دوران ہجرت کسی بات پر ناراض اور رنجیدہ ہوئے۔

(۵) طبعی خوف اور طبعی رنج (حزن) چونکہ غیر اختیاری ہوتا ہے لہذا یہ نہ تو قابلِ مذمت ہے اور نہ ہی قابلِ مواخذہ ہے۔ ایسے خوف وحزن سے تو حضرات انبیاء علیہم السلام بھی مستثنیٰ نہیں ہیں۔ مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں ایک قبطی نادانستہ مارا گیا تو آپ نے وطن چھوڑا اور مدین کے راستے پر ہولئے آپ اس وقت خوف زدہ تھے۔ خَآئِفًا يَتَرَقَّبُ (۱۶) ''یعنی آپ (نے شہر میں صبح اس حال میں کی کہ آپ) خوفزدہ تھے (اور آئندہ کی صورت حال کے) منتظر تھے''۔ جب مدین میں حضرت شعیب علیہ السلام کے گھر پہنچے تو حضرت شعیب علیہ السلام نے آپ کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا لَا تَخَفْ نَجَوْتَ مِنَ

الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ (۱۷) ''یعنی (اے موسیٰ) نہ ڈر تو ظالم قوم سے نجات پا چکا ہے''۔ کوہ طور پر آپ نے بحکم الٰہی اپنا عصا زمین پر پھینکا اور وہ اژدھا بن گیا تو آپ ڈر کر پیچھے کو مڑے۔ وَلّٰی مُدْبِرًا وَّلَمْ یُعَقِّبْ یٰمُوْسٰٓی اَقْبِلْ وَلَا تَخَفْ اِنَّکَ مِنَ الْاٰمِنِیْنَ (۱۸) ''یعنی اس (موسیٰ) نے پیٹھ پھیری اور پیچھے مڑ کر نہ دیکھا (ہم نے کہا) اے موسیٰ! آگے آ اور نہ ڈر بے شک تجھے امن حاصل ہے''۔ آپ کو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ فرعون کے پاس جا کر اسے اللہ کے دین کی دعوت دو تو آپ نے کہا۔ فَاَخَافُ اَنْ یَّقْتُلُوْنِ (۱۹) ''یعنی۔ مجھے ڈر لگتا ہے کہ وہ مجھے قتل کر دیں گے''۔ آپ کی خواہش پر اللہ تعالیٰ نے آپ کے بھائی حضرت ہارون کو بھی آپ کے ہمراہ کر دیا لیکن دونوں بھائیوں نے یہ کہا۔ رَبَّنَآ اِنَّنَا نَخَافُ اَنْ یَّفْرُطَ عَلَیْنَآ اَوْ اَنْ یَّطْغٰی (۲۰) ''یعنی اے ہمارے رب! ہمیں ڈر لگتا ہے کہ کہیں وہ (فرعون) ہم پر زیادتی نہ کرے یا سرکشی سے کام نہ لے''۔ جب جادوگروں نے اپنے ڈنڈے زمین پر پھینکے اور وہ سپولئے بن گئے تو حضرت موسیٰؑ نے پہلے پہل اپنے دل میں خوف محسوس کیا فَاَوْجَسَ فِیْ نَفْسِهٖ خِیْفَةً مُّوْسٰی (۲۱) جب برادران یوسفؑ نے اپنے والد ماجد حضرت یعقوب علیہ السلام سے درخواست کی کہ یوسف علیہ السلام کو ہمارے ہمراہ جنگل میں بھیج دیجئے تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے خوف اور حزن کا یوں حوالہ دیا۔ قَالَ اِنِّیْ لَیَحْزُنُنِیْٓ اَنْ تَذْهَبُوْا بِهٖ وَاَخَافُ اَنْ یَّاْكُلَهُ الذِّئْبُ وَاَنْتُمْ عَنْهُ غٰفِلُوْنَ (۲۲) ''یعنی (یعقوبؑ نے) کہا کہ مجھے یہ بات رنجیدہ کرتی ہے کہ تم اس (یوسف) کو لے جاؤ اور مجھے خوف ہے کہ اسے بھیڑیا کھا جائے گا اور تم اس سے غافل'' ہو جاؤ گے خود افضل الرسل حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ارشاد ہے۔ قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَیَحْزُنُكَ الَّذِیْ یَقُوْلُوْنَ فَاِنَّهُمْ لَا یُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِیْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ یَجْحَدُوْنَ (۲۳) ''یعنی ہمیں بلاشبہ اس بات کا علم ہے کہ جو کچھ وہ (کفار مکہ) کہتے ہیں اس سے تجھے رنج پہنچتا ہے''۔

دیکھئے اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام بیسیوں مرتبہ طبعی خوف کا شکار ہوئے ہوں۔ حضرت ہارون کو ان کے ہمراہ کیا گیا تو بھی دونوں فرعون کے پاس جانے سے طبعی خوف محسوس کریں۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کو خوف وحزن دونوں لاحق ہوں۔ خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو طبعی حزن (رنج) لاحق ہو تو ان حضرات انبیاء علیہم السلام کے مرتبۂ نبوت میں ہرگز کوئی خلل واقع نہیں ہوتا۔ ہمارے امامیہ بھائیوں کے خیال میں حضرات ائمہ کرام مدت العمر خوف میں مبتلا ہونے کی وجہ سے تقیہ وکتمان کے پابند رہے اور بقول ان کے اسی خوف کی وجہ سے امام مہدیؑ غار میں پوشیدہ ہوئے تو زیر بحث آیت غار کی رو سے اگر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو غار ثور میں حزن (رنج) لاحق ہوا تو ان کے مرتبۂ صدیقیت میں بھی ہرگز کوئی کمی

واقع نہیں ہوتی ۔قرآن کریم میں جو فرمایا گیا ہے۔ اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰہِ لَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ (۲۴) ''یعنی اللہ کے اولیا پر نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ ہی وہ رنجیدہ ہونگے'' تو اس آیت میں آخرت کے خوف وحزن کی بات کی گئی ہے کہ آخرت میں اللہ کے اولیاء کو ایسا خوف لاحق نہیں ہوگا جو بعد میں حقیقت میں بدل جائے کیونکہ خوف مصیبت کے واقع ہونے سے پہلے ہوا کرتا ہے۔ جہاں تک حزن (رنج) کی بات ہے تو رنج مصیبت کے واقع ہونے کے بعد ہوا کرتا ہے چونکہ آخرت میں اولیاء اللہ پر کوئی مصیبت آئے گی ہی نہیں لہذا رنج کا کوئی سوال پیدا ہوتا ہی نہیں۔ دنیا میں ایسے خوف اور حزن کی بھی انبیائے کرام علیہم السلام اور ان کے سچے وارثین سے نفی کی گئی ہے جس سے حق گوئی اور حق پر عمل کرنے میں فرق آئے۔ طبعی اور غیر اختیاری خوف وحزن اس سے مستثنیٰ ہے۔

(۶) ہر زبان اور ہر لغت میں ''تو رنج نہ کر'' ''تم رنج نہ کرو'' کے مفہوم کو ادا کرنے والے الفاظ ہمیشہ رنجیدہ اور غم زدہ مخاطب کی تسلی اور دلاسے کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ اس طرح کے خطاب کو ہرگز تہدید وتنبیہ (ڈانٹ ڈپٹ) نہیں کہا جاسکتا۔ پورے قرآن کریم میں ہرگز یہ بات نہیں ملے گی کہ اللہ تعالیٰ نے حضرات انبیا علیہم السلام اور انکے مخلص ساتھیوں کے مخالفین اور معاندین کفار اور فاسقین و فجار کو لاتحزن (تو غم نہ کر)، لاتحزنی (تو ایک عورت غم نہ کر)، لاتحزنوا (تم غم نہ کرو)، جیسے کلمات سے کبھی مخاطب کیا ہو۔ اللہ تعالیٰ نے ان کلمات سے ہمیشہ اپنے مقرب ومحبوب بندوں کو ہی مخاطب فرمایا ہے درج ذیل قرآنی آیات پر سیاق وسباق کی روشنی میں غور کیجئے:۔

فَنَادٰھَا مِنْ تَحْتِھَآ اَلَّا تَحْزَنِیْ قَدْ جَعَلَ رَبُّکِ تَحْتَکِ سَرِیًّا ○ وَھُزِّیْٓ اِلَیْکِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسٰقِطْ عَلَیْکِ رُطَبًا جَنِیًّا ○ فَکُلِیْ وَاشْرَبِیْ وَقَرِّیْ عَیْنًا (۲۵) ''یعنی اس (مریم) کو نیچے سے فرشتے نے آواز دے کر کہا کہ تو رنج نہ کر بے شک تیرے رب نے تیرے نیچے چشمہ جاری کیا ہے۔ تو کھجور کے تنے کو پکڑ کر اپنی طرف ہلا تو تجھ پر تر وتازہ کھجوریں گریں گی۔ بس تو کھا اور پی اور اپنی آنکھیں ٹھنڈی کر۔

فَاِذَا خِفْتِ عَلَیْہِ فَاَلْقِیْہِ فِی الْیَمِّ وَلَا تَخَافِیْ وَلَا تَحْزَنِیْ (۲۶) یعنی (اے موسیٰ کی ماں!) اگر تجھے اس (موسیٰ) کے بارے میں خوف ہو تو تو اسے سمندر میں ڈال دے اور تو نہ خوف کھا اور نہ ہی رنج کر''

وَلَا تَحْزَنْ عَلَیْھِمْ وَلَا تَکُ فِیْ ضَیْقٍ مِّمَّا یَمْکُرُوْنَ (۲۷) ''یعنی (اے پیغمبر!) تو ان پر رنج نہ کر اور جو سازشیں اور تدبیریں وہ کرتے ہیں ان کے متعلق تنگی میں مبتلا نہ ہو''

وَقَالُوْا لَاتَخَفْ وَلَا تَحْزَنْ اِنَّا مُنَجُّوْکَ وَاَھْلَکَ اِلَّا امْرَاَتَکَ (۲۸) ''یعنی (فرشتوں نے لوط سے) کہا تو نہ ڈر اور نہ ہی رنجیدہ ہو بے شک ہم تجھے اور تیرے گھرانے کو سوائے تیری بیوی کے نجات دینے والے ہیں''۔

وَلَا تَھِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ کُنْتُمْ مُؤْمِنِیْنَ (۲۹) ''یعنی (اے مسلمانو!) تم سست نہ بنو اور نہ تم رنج کرو، تم ہی غالب رہو گے اگر تم ایمان والے ہو''۔

تَتَنَزَّلُ عَلَیْھِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّۃِ الَّتِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ (۳۰) یعنی (بوقتِ موت ان (نیک لوگوں) پر فرشتے نازل ہوتے ہیں کہ تم نہ ڈرو اور نہ ہی رنج کرو اور اس جنت کی خوشخبری حاصل کرو جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا رہا ہے''۔

پس آیتِ غار میں بھی لَاتَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا کا مضمون تسلی اور دلاسے کا ہے اس سے حضرت ابوبکر صدیق کا مقرب بارگاہ الٰہی ہونا بھی ثابت ہوا یہ بھی ثابت ہوا کہ طبعی خوف وحزن غیر اختیاری ہونے کی بنا پر لائقِ ملامت نہیں ہے۔

(۷) حضرت یوسف علیہ السلام نے قید خانے میں اپنے دو قیدی ساتھیوں کو یٰصَاحِبَیِ السِّجْنِ (اے میرے جیل کے دونوں ساتھیو!) کے الفاظ سے مخاطب فرمایا کہ سیاقِ کلام کی رو سے وہ آپ کے ایمان کے ساتھی نہیں تھے بلکہ صرف جیل کے ساتھی تھے۔ آیتِ غار میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کو سیاقِ کلام کی رو سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا صاحب (ساتھی) اس معنی میں کہا گیا ہے کہ آپ صرف زمان ومکان کے لحاظ سے ہی رسول اکرم ﷺ کے ساتھی نہیں بلکہ خاص الخاص معیت الٰہیہ میں آپ کے ساتھ ہیں لہٰذا ایمان کے اعلیٰ درجہ پر فائز بھی ہیں پس لفظ ''صاحب'' میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے لئے بشارت اور مدح کا پہلو بخوبی واضح ہے۔

(۸) مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کی جانب ہجرت کے موقع پر تاریخی روایات کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنے کی نیت سے قریش مکہ نے آپ کے مکان کا محاصرہ کر رکھا تھا آپ نے سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنے بستر پر لٹایا اور خود وہاں سے اس طرح نکلے کہ اللہ تعالیٰ نے دشمنوں کی نظر سے آپ کو محفوظ رکھا۔ بعد میں قریش کو اپنی ناکامی کا علم ہوا تو وہ رسول اکرم ﷺ اور آپ کے یارِ غار حضرت ابوبکر صدیق کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ انہوں نے مکہ میں حضرت علیؓ یا کسی اور پر ایسا تشدد نہیں کیا جس سے انہیں پتہ چلتا کہ رسول اکرم ﷺ کہاں ہیں۔ کیونکہ انہیں یقین تھا کہ عام گھریلو معاملات میں تو بے شک حضرت علیؓ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے رازداں ہو سکتے ہیں اور اہل بیت میں شامل ہونے کی

وجہ سے انہیں ہونا بھی چاہئے لیکن اس طرح کے حالات میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے راز داں اور محرم اسرار صرف ابوبکر صدیقؓ ہی ہو سکتے ہیں ورنہ وہ یقیناً حضرت علیؓ پر تشدد کرتے۔ بے شک حضرت علیؓ کی شجاعت و بہادری میں کوئی کلام نہیں ہے لیکن آپ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے تو زیادہ بہادر نہیں تھے کہ اس موقع پر قریش مکہ آپ سے مرعوب و خائف ہوتے۔ غزوۂ احد میں جب مسلمانوں کا نقصان ہوا تو ایک موقع پر قریش مکہ کے سردار ابوسفیان نے بلند آواز سے کہا تھا۔ ''کیا محمد ﷺ زندہ ہیں'' جواب نہ ملا تو اس نے کہا ''کیا ابوبکرؓ زندہ ہیں؟'' جواب نہ ملنے پر اس نے کہا ''کیا عمرؓ زندہ ہیں''۔ اس پر حضرت عمرؓ پکار اٹھے تھے ''اے دشمنِ خدا ہم سب زندہ ہیں'' ابوسفیان نے کسی اور صحابی مثلاً حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ وغیرہ کا نام نہیں لیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ کفار بھی حضرت ابوبکر صدیقؓ اور عمر فاروقؓ دونوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انتہائی مقرب ساتھی خیال کرتے تھے۔

(۹) جس کام سے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے منع فرمایا ہو، وہ کام بذاتِ خود کتنا ہی برا کیوں نہ ہو، ممانعت سے قبل اس کا ارتکاب معصیت نہیں۔ البتہ ممانعت کے بعد اس کا دیدہ و دانستہ ارتکاب معصیت اور نافرمانی سمجھا جائے گا لہذا یہ شبہ انتہائی لغو ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کو ''لاتحزن (تو رنج نہ کر)'' کے ذریعہ رنجیدہ ہونے سے اس لئے منع کیا گیا کہ (معاذ اللہ) وہ معصیت میں مبتلا تھے۔ ورنہ اس طرح کا اعتراض تو بشمول حضرات انبیاء علیہم السلام بہت سے دیگر حضرات بلکہ افضل البشر رسول اکرم ﷺ پر بھی وارد ہوگا کیونکہ قرآن کریم میں آپ کو بھی رنجیدہ اور غمگین ہونے سے بسا اوقات منع کیا گیا ہے مثلاً ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِي ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُونَ (۳۱) ''یعنی (اے پیغمبر!) تو ان پر رنجیدہ نہ ہو اور نہ ہی ان کی خفیہ تدبیروں کے بارے میں تنگی میں مبتلا ہو''۔ جہاں تک لاتحزن (تو رنج نہ کر) جیسے الفاظ کا تعلق ہے تو یہاں ممانعت سے قبل بھی رنجیدہ اور غمگین ہونا ہرگز کوئی برا کام تھا ہی نہیں کیونکہ یہ حزن غیر اختیاری ہے جیسا کہ قبل ازیں واضح کیا جا چکا ہے۔ رنج و غم اگرچہ غیر اختیاری ہوتا ہے لیکن محزون و مغموم شخص کو تسلی دی جائے تو اس سے بسا اوقات اس کا رنج دور ہوتا ہے یا ہلکا ہو جاتا ہے تو اس طرح کی تمام آیات تسلیہ (تسلی اور دلاسہ دینے) کے مضمون پر مشتمل ہیں۔

(۱۰) آیت کے حصہ فَأَنزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَيْهِ (تو اللہ نے اس پر اپنا سکینہ یعنی اطمینان نازل کیا)'' میں ''علیہ'' کی ضمیر واحد غائب اگر حضرت ابوبکر صدیقؓ کی طرف راجع ہے تو آپ کا مقام و مرتبہ از خود واضح ہو گیا۔ اگر اس ضمیر کا مرجع رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو قرار دیا جائے تو ثابت ہوا کہ رسول اکرم ﷺ بھی پریشان و رنجیدہ تھے ورنہ آپ پر نزول سکینہ کی ضرورت ہی کیا تھی؟ تو جو بھی

اعتراضات حضرت ابوبکر صدیقؓ کے رنجیدہ اور غمگین ہونے پر کئے جائیں وہ سب کے سب کالعدم ہوگئے۔ اس صورت میں یہ کہا جائے گا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر براہ راست سکینہ (اطمینان) نازل ہوا اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کو یہ سکینہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے توسط سے حاصل ہوا۔ کیونکہ آپ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ سے فرمایا تھا "لَاتَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا۔ چونکہ رسول اکرم ﷺ بڑے ہیں اس لئے آپ پر سکینہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے براہ راست نازل ہوا اور ابوبکر صدیقؓ کو آپ کے ذریعہ یہ سکینہ حاصل ہوا۔ چنانچہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال پُر ملال کے موقعے پر پہلے پہلے تمام اصحاب شدید رنج میں مبتلا تھے چونکہ حضرت ابوبکر صدیقؓ ان سب میں بڑے تھے لہذا اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو سکینہ براہِ راست حاصل ہوا اور دیگر صحابہ کرامؓ کو آپ کے توسط سے حاصل ہوا کہ آپ نے اس موقع پر صحابہ سے خطاب کیا اور انہیں تسلی دی تو انہیں بھی اطمینان حاصل ہوگیا۔ اس سے آپ کا افضل الصحابہ ہونا اور آپ کی خلافت کا حق ہونا بھی واضح ہوا۔

یہاں "فانزل اللہ" میں "فا" کا تعقیب کے لئے ہونا ضروری نہیں یعنی اس "فا" سے یہ لازم نہیں آتا کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلے سے سکینہ (اطمینان) پہلے حاصل ہوا ہو اور رسول اکرم ﷺ کو یہ سکینہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بعد میں حاصل ہوا ہو کیونکہ "فا" کا ہمیشہ تعقیب (مؤخر ہونا) کو ظاہر کرنے کے لئے ہونا ہرگز ضروری نہیں مثلاً سورہ مائدہ میں نماز کے لئے وضو کا حکم یوں دیا گیا ہے یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ الآیة (۳۲) "اے مسلمانو! جب تم نماز کے لئے کھڑے ہوا کرو تو اپنے چہرے دھولیا کرو آخر آیت تک" یہاں آیت میں "فاغسلوا" پر "فا" تعقیب کے لئے نہیں۔ آیت کا یہ مطلب نہیں کہ نماز پہلے ادا کرلیا کرو اور وضو بعد میں کیا کرو۔ تاہم اگر آیت غار کے مذکورہ متعلقہ حصے کی "فا" کے متعلق اصرار کیا جائے کہ یہ تعقیب کے لئے ہے تو اس سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس صورت میں یہ کہا جائے گا کہ گو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی پریشان اور رنجیدہ تھے لیکن آپ نے اپنی پریشانی کو چھپاتے ہوئے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو تسلی دی بعد میں اللہ تعالیٰ نے خود آپ پر بھی سکینہ نازل فرمادیا۔ بسا اوقات کسی بڑی مصیبت و آفت کے موقع پر بزرگ حضرات اپنے رنج اور پریشانی کو چھپاتے ہیں اور چھوٹے اعزہ واقارب کو تسلی دیا کرتے ہیں کیونکہ اگر بزرگ بھی رنج والم کا اظہار کرنے لگیں تو چھوٹے اعزہ واقارب کو کون تسلی دے گا؟ بڑوں کی اس حالت کو دیکھ کر ان کا رنج وغم تو اور بھی بڑھ جائے گا۔

آیت غار اور اس کے متعلقات کو زیر بحث لانے سے اور تمام شبہات واعتراضات کے ازالے اور

ابطال سے واضح ہوگیا کہ ایک طرف رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم "بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر" کے مصداق ہیں تو دوسری طرف حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اللہ تعالیٰ کی خاص الخاص معیتِ رحمت میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے شریک وسہیم ہونے کی بنا پر "بعد از انبیا بزرگ توئی قصہ مختصر" کے مصداق ہیں۔

(ب) بحوالہ آیتِ تمکین:-

سورۂ حج میں اللہ تعالیٰ نے مہاجرین مکہ کے کئی اوصاف بیان فرمائے ہیں کہ "یہ مہاجرین مظلوم ہیں انہیں ان کے وطن سے ناحق باہر نکالا گیا ان کا قصور صرف یہ تھا کہ وہ کہتے ہیں کہ ہمارا رب اللہ ہے یعنی موحد کامل ہیں اب ان مظلوموں کو اپنے مخالفین سے جہاد وقتال کی اجازت دی جاتی ہے اللہ تعالیٰ ان مجاہدین کی مدافعت کرے گا کیونکہ وہ ان کی مدد پر قادر ہے اور جو شخص بھی اللہ (کے دین) کی مدد کرے اللہ ضرور بالضرور اس کی مدد کرے گا۔ اگر اللہ تعالیٰ قتال فی سبیل اللہ کا حکم نہ دے اور جہاد نہ ہو تو خانقاہیں، یہودیوں کے عبادت خانے، گرجے اور (مسلمانوں کی) مساجد جن میں اللہ کا نام بہت لیا جاتا ہے، سب کے سب (مفسدین کے ہاتھوں) مسمار کردیئے جائیں۔ اللہ زبردست ہے اور طاقتور ہے اس لئے وہ ان مظلوم مہاجرین کی مدد کرے گا" (۳۳) مہاجرین کے مذکورہ اوصاف اور ان کے لئے فتح ونصرت کی بشارت کے ساتھ اذنِ جہاد اور ان کے مخالفین کی مغلوبیت کی پیشگوئی کے بعد اللہ تعالیٰ نے اگلی آیت میں (جسے آیتِ تمکین کہا جاتا ہے) ارشاد فرمایا اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ وَلِلّٰہِ عَاقِبَۃُ الْاُمُوْرِ (۳۴) "یعنی (یہ مہاجرین وہ لوگ ہیں کہ) اگر ہم انہیں زمین میں حکومت دیں تو وہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ ادا کریں گے، نیکی کا حکم دیں گے اور برے کاموں سے منع کریں گے اور سب کاموں کا انجام اللہ ہی کے لئے ہے"۔

مذکورہ بالا آیت سے صاف معلوم ہوا کہ خلفائے راشدین اس کا مصداق ہیں کیونکہ وہ سب کے سب مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ پہنچے تھے دیگر مہاجرین کی طرح وہ بھی مظلوم تھے کہ محض عقیدۂ توحید اور رسول اکرم ﷺ کی رسالت پر پختہ ایمان کی وجہ سے انہیں ناحق ان کے گھروں سے نکالا گیا تھا۔ جس نعمت سے کسی قوم کے سب افراد کو فائدہ پہنچے تو اس کی نسبت پوری قوم کی طرف کردی جاتی ہے چنانچہ آیت میں لفظ "مکنا ھم" کا یہ مفہوم نہیں کہ ہر فرد کو حکومت ملے گی۔ ایسی نعمتیں جب کسی جماعت کی طرف منسوب کی جاتی ہیں تو پوری قوم یا پوری جماعت نہیں بلکہ کوئی خاص شخص یا چند خاص اشخاص مراد ہوتے ہیں لیکن اس نعمت کا فائدہ سب کو پہنچتا ہے۔ لسانی محاورات میں مثلاً کہہ دیا جاتا ہے کہ پنجاب میں پنجابی

کی حکومت ہے حالانکہ حاکم اعلیٰ تو فردِ واحد ہی ہوگا۔ آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ خلفائے راشدین اور ان کے ساتھ دیگر مہاجرین مکہ سب کے سب مومنین کاملین میں سے ہیں کیونکہ آیت میں جمع کے صیغے لائے گئے ہیں اور نصرت وفتح کی بشارت میں سب ہی کو مخاطب کیا گیا ہے، یہ بھی معلوم ہوا کہ خلفائے راشدین خصوصاً و دیگر مہاجرین عموماً اعمال صالحہ سے موصوف ہیں، زمین میں حکومت حاصل کر لینے کے باوجود اور استحکام حکومت کے باوجود یہ لوگ اللہ تعالیٰ کو بھول نہیں جائیں گے بلکہ عظیم الشان بادشاہت کے مالک بن کر بھی اللہ کی عبادت اور اللہ کے کاموں میں ان کی مشغولیت ویسی ہی رہے گی جیسی پہلے تھی۔ خلیفہ اور حاکم بننے کے بعد بھی یہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ ادا کریں گے، نیکی کا حکم دیں گے اور برے کاموں سے منع کریں گے یعنی ان کے سب کام شریعت کے مطابق ہوں گے۔ اگر ان حضرات نے خلاف شرع کام کرنے ہوتے تو علام الغیوب اللہ تعالیٰ ان کی مدح نہ فرماتا۔

اگر کہا جائے کہ ان آیات کا مصداق صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں تو اس سے واضح ہوا کہ حضرت علیؓ کو تمکین یعنی غلبہ اور استحکام حاصل تھا اور آیتِ تمکین کی رو سے وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے کنارہ کشی یا چشم پوشی نہیں کر سکتے تھے۔ انہوں نے اسی قرآن کریم کو بحال رکھا جس کی لغتِ قریش پر جمع وتدوین حضرت عثمانؓ نے کرائی تھی اور اسے بلادِ اسلام میں پھیلا دیا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے رمضان المبارک میں تراویح کی نماز باجماعت کا جو انتظام اور اہتمام کرایا تھا، حضرت علیؓ نے اسے بھی بحال رکھا۔ اموال فے اور باغِ فدک کے معاملے میں جو طرزِ عمل پہلے خلفا کا تھا اس میں سرمو کوئی تبدیلی حضرت علیؓ نے نہیں فرمائی اور حضرات حسنین رضی اللہ عنہما کو اموال فدک کا ہرگز مالک نہیں بنایا وغیرہ وغیرہ، سب امور میں حضرت علیؓ کا رویہ وہی رہا جو پہلے خلفا کے دور میں تھا البتہ ہر خلیفہ اور حاکم کو انتظامی تبدیلیوں اور اصلاحات کا حق ہوتا ہے، سیدنا حضرت علیؓ نے صوبوں پر نئے عمال کا تقرر کیا تو اس سے آپ کا اپنے پیشرو خلفا سے کوئی دینی اختلاف ہرگز ثابت نہیں ہوتا۔ اب اگر یہ کہا جائے کہ حضرت علیؓ کو حکومت برائے نام ملی تھی وہ مجبور تھے تو اس طرح کی باتیں آیتِ تمکین کے مفہوم سے ہرگز ہم آہنگ نہیں۔ سیدنا حضرت علیؓ آیت تمکین کا مصداق تبھی تو ہوں گے جب وہ فی الواقع صاحبِ تمکین ہوں۔ اگر انہیں تمکین وغلبہ حاصل تھا تو مذکورہ بحث کی روشنی میں پہلے تین خلفا کی خلافت کا صحیح ہونا بھی ثابت ہو گیا پس یہ مفروضہ غلط ثابت ہوا کہ آیت تمکین کا مصداق صرف حضرت علیؓ ہیں بلکہ سب خلفائے راشدین اس کا مصداق ہیں۔ چنانچہ قبائل عرب، حکومت روم وایران، ممالک عراق، یمن، حبشہ، مصر وغیرہ خلفائے راشدین کے دور میں ہی اسلامی مملکت میں شامل ہوئے۔ اگر یہ کہا جائے کہ سیدنا حضرت علیؓ کو اپنے دور میں تمکین حاصل نہ تھی تو

جواب یہ ہے کہ یہاں تمکین فی الارض سے آیات کے سیاق وسباق کی روشنی میں کفار پر غلبہ مراد ہے۔ سیدنا حضرت علیؓ کے دور خلافت میں مسلمانوں کی باہم خانہ جنگی کے باوجود کفر مغلوب تھا اور مغلوب رہا۔

علامہ فتح اللہ کاشانی، مشہور شیعہ مفسر، اپنی تفسیر منہج الصادقین میں ان آیات کی تفسیر یوں پیش فرماتے ہیں

حق تعالیٰ درس آیت وعدہ دادہ مظلومان صحابہ را بہ نصرت وایفائے وعدہ آں کردہ چہ تسلط مہاجر وانصار نمود بر ضادید عرب واکابر اکاسرۂ عجم وقیاصرہ ایشاں وزمین ودیار ایشاں را بمسلمانان تفویض فرمودہ..... (۳۵) ''یعنی اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں مظلوم صحابہؓ سے نصرت کا وعدہ فرمایا ہے اور اس وعدے کو یوں پورا فرمایا ہے کہ بڑے بڑے اہل عرب اور عجم کے اکاسر اور قیاصرہ (کسریٰ اور قیصر کے القاب سے ملقب ایران وروم کے حکمران) معہ اپنے علاقوں اور حکومتوں کے مہاجرین وانصار کے زیر تسلط آ گئے اور مسلمان ان علاقوں کے مالک ہو گئے''

فروع کافی کتاب الجہاد میں امام جعفر صادقؒ کی ایک حدیث مذکور ہے جو بہت طویل ہے اور کئی صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ ابوعمر زبیدی نے امام جعفرؒ سے سوال کیا کہ تبلیغ دین، دعوت دین اور جہاد فی سبیل اللہ ہر ایک مسلمان کے لئے جائز ہے یا کسی خاص جماعت کے لئے ہے اس کے جواب میں امامؒ نے فرمایا ''..... جہاد کی اجازت اس وقت تک نہیں جب تک مظلوم نہ ہو اور مظلوم نہیں جب تک مومن نہ ہو اور مومن تب ہوتا ہے جب ان ایمانی اوصاف سے متصف ہو جو اللہ تعالیٰ نے مومنین مجاہدین کے لئے مقرر فرمائے ہیں۔ جب ان شرائط میں مکمل ہو گیا تو مومن ہو گا اور جب مومن ہو گا تو لازماً مظلوم ہو گا اور مظلوم کو جہاد کی اجازت ملی ہے کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّھُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰہَ عَلٰی نَصْرِھِمْ لَقَدِیْرُ یعنی ان لوگوں کو جنگ کی اجازت دی گئی جن سے جنگ کی جاری رہی ہے کیونکہ وہ مظلوم ہیں اور اللہ ان کی مدد پر قادر ہے..... راوی کہتا ہے میں نے امام سے سوال کیا کہ مکہ والوں نے تو ان مہاجرین پر ظلم کئے تھے اس لئے مکہ والوں سے جنگ کرنے کی اجازت تو اس آیت سے ظاہر ہے مگر انہوں نے قیصر وکسریٰ اور دوسرے عرب قبائل سے جنگ کس بنا پر کی تو امام نے جواب دیا ولکن المھاجرین ظلموا من جھتین ظلمھم اھل مکۃ باخراجھم من دیارھم واموالھم فقاتلوھم باذن اللہ لھم فی ذالک وظلمھم کسری و قیصر و من کان من دونھم من قبائل العرب و العجم بما کان فی ایدیھم ماکان المومنون احق بہ منھم فقاتلوھم باذن اللہ عزّ وجلّ لھم فی ذالک..... (۳۶) یعنی مہاجرین تو دو طرح سے مظلوم ہیں اول اہل مکہ نے ان پر ظلم کیا انہیں گھروں سے

نکالا اوران کے اموال چھین لئے اس لئے وہ اہل مکہ سے باذن اللہ جنگ کرتے رہے، اور قیصر وکسریٰ اور قبائل عرب وعجم کا ظلم یہ تھا کہ وہ اللہ کی زمین پر ناحق قابض تھے ان کے مقابلے میں مسلمان اس کے زیادہ حقدار تھے لہذا ان کے خلاف مہاجرین کی جنگ بھی اللہ ہی کے حکم سے تھی.....''

امام جعفر صادقؒ کی یہ حدیث بہت لمبی ہے فضائل ومناقب کی کوئی بات ایسی نہیں ہے جو اس حدیث میں صحابہ کرام کے لئے ثابت نہ کی گئی ہو اور کوئی عیب ایسا نہیں جس سے صحابہ کا پاک دامن ہونا واضح نہ ہوتا ہو۔ ہم نے اس لمبی حدیث کے ایک دو اقتباسات نقل کردیئے ہیں جو متعلقہ موضوع زیر بحث کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں۔ اس حدیث کے آخر میں امام نے یہ بھی فرمایا کہ ہم تمام باتیں بیان کر چکے اب ہر شخص کو چاہئے کہ جھوٹی حدیثوں کے گھڑنے سے بچے جن کی قرآن تکذیب کرتا ہے۔

یہ کہنا انتہائی لغو ہوگا کہ اس حدیث سے مہاجرین کے لئے جہاد کی اجازت کا تو ثبوت ملتا ہے لیکن خلفائے راشدین کی خلافت ثابت نہیں ہوتی۔ مہاجرین مکہ کا قیصر وکسریٰ کے خلاف جہاد خلفا کی مرضی اور اجازت کے بغیر کیسے ہوگیا اور خلفا کو اس جہاد کی اجازت کس نے دی؟ آیات زیر بحث سے صاف واضح ہے کہ یہ اجازت اللہ نے انہیں دی اور اس کی تائید حضرت امام جعفر صادقؒ بھی فرمارہے ہیں اور اللہ نے اجازت انہی کو دی ہے جو ایمان اور اعمال صالحہ کی نعمت ودولت سے مالا مال ہیں۔

اگر کہا جائے کہ پہلے تین خلفا کو جہاد کے متعلق مفید مشورے حضرت علیؓ نے دیئے تھے تو اگر یہاں مشورے کو اجازت کا معنی ہی پہنا دیا جائے تو یہ اجازت خواہ اللہ تعالیٰ نے دی یا اللہ کے حکم سے حضرت علیؓ نے دی، ایک ہی بات ہے۔ بہر حال اس جہاد کی اجازت انہی لوگوں کے لئے ہے جو مومن و صالح ہوں۔ نیز اس صورت میں یہ بھی ماننا پڑے گا کہ خلفائے ثلاثہ حضرت علیؓ کو اپنا ہمدرد اور خیر خواہ مومن بھائی سمجھتے تھے تب ہی تو وہ ان سے مشورے لیتے تھے اور حضرت علیؓ بھی نہایت خلوص اور وفاداری سے انہیں صحیح مشورے دیتے تھے ورنہ اگر یہ خلفائے ثلاثہ (معاذ اللہ) منافق یا کافر ہوتے تو حضرت علیؓ اسد اللہ الغالب کا اولین فرض تھا کہ وہ ان کے خلاف جہاد کرتے اور ہرگز انہیں مفید مشورے نہ دیتے۔

اگر کہا جائے کہ مذکورہ حدیث میں (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) امام جعفر صادقؒ نے تقیے سے کام لیا ہے تو پھر ان کی کونسی بات کا اعتبار باقی رہ جائے گا؟۔ نیز اس صورت میں مختصر کلام بھی کافی ہوتا لیکن امامؒ نے سائل کے سوال کے جواب میں نہایت لمبی تقریر فرمائی جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ آپ سے یہ کلام نہایت شرح صدر (کھلے دل) سے صادر ہوا ہے۔

(ج) بحوالہ آیت قتال مرتدین:-

سورۂ مائدہ میں ہے۔ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَنْ یَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِیْنِهٖ فَسَوْفَ یَاْتِی اللّٰهُ بِقَوْمٍ یُّحِبُّهُمْ وَیُحِبُّوْنَهٗٓ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِیْنَ یُجَاهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَلَا یَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ یُؤْتِیْهِ مَنْ یَّشَآءُ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ (۳۷) ''اے ایمان والو! اگر تم میں سے کوئی مرتد ہو جائے گا تو بہت جلد اللہ ایک ایسی قوم کو (مرتدین کے مقابلے میں) لے آئے گا جن سے اللہ محبت کرتا ہو اور وہ اس (اللہ) سے محبت کرتے ہوں یہ لوگ ایمان والوں کے لئے متواضع اور کفار کے لئے سخت گیر ہونگے وہ اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے وہ نہیں ڈریں گے۔ یہ اللہ کا فضل ہے جسے وہ چاہے عطا فرماتا ہے اور اللہ بڑی وسعت والا اور علم رکھنے والا ہے''۔

اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت میں فتنۂ ارتداد کی پیشگوئی فرمائی ہے اور ان لوگوں کے اوصافِ جمیلہ بھی بیان فرمائے ہیں جن کے ہاتھوں سے یہ فتنہ نیست و نابود ہوگا۔ یہ سب جانتے ہیں کہ فتنۂ ارتداد کا آغاز خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کے آخری ایام میں ہو چکا تھا۔ اسود عنسی، مسیلمہ کذاب اور طلیحہ اسدی نے نبوت کا جھوٹا دعویٰ کر دیا تھا۔ اسود عنسی کی سرکوبی کے لئے رسول اکرم ﷺ نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو مامور فرمایا تھا۔ ان کے لشکر میں ایک شخص فیروز نے اسود عنسی کو قتل کر ڈالا۔ رسول اکرم ﷺ نے بذریعہ وحی الٰہی اس کے قتل کی اطلاع بھی مسلمانوں کو سنا دی تھی۔ مسیلمہ کذاب، حضرت ابوبکر صدیقؓ کے دور خلافت میں جہنم رسید ہوا اس کے خلاف حضرت ابوبکرؓ نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ سے لشکر کشی کرائی تھی اور یہ حضرت وحشی کے ہاتھوں مقتول ہوا تھا۔ طلیحہ اسدی کے فتنے کا بھی ابوبکر صدیقؓ کے حکم سے حضرت خالدؓ بن ولید نے ہی قلع قمع کیا تھا طلیحہ میدان جنگ سے بھاگ گیا تھا بعد میں تائب ہو گیا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے بعد فتنہ ارتداد میں شدت پیدا ہوئی۔ حرمین شریفین اور بحرین کے مضافات میں واقع شہر جواثی کے سوا اکثر علاقوں کے لوگ مرتد ہو گئے اور بعض لوگوں نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا۔ اس فتنے کا حضرت ابوبکر صدیقؓ نے نہایت سختی سے قلع قمع کیا اور معمولی سے تساہل کو بھی برداشت نہیں کیا۔ تمام صحابہ کرامؓ نے آپ کا جوش و خروش سے ساتھ دیا اور آپ کے اس کارنامے کو تمام صحابہ نے بڑی عزت کی نظر سے دیکھا۔ جب تک فتنہ ارتداد ظاہر نہیں ہوا تھا اس وقت تک پتہ نہیں چل سکتا تھا کہ اس آیت میں کس جماعت کی تعریف ہو رہی ہے مگر اس فتنے کے ظہور

کے بعد اور صدیق اکبرؓ کے ذریعہ اس کے عملی استیصال کے بعد واضح ہو گیا کہ صدیق اکبرؓ اور آپ کے رفقا کی جماعت ہی وہ جماعت ہے جس کے اوصاف آیت میں بیان ہوئے ہیں یہ لوگ اللہ کے محبوب ہیں اور اللہ ان کا محبوب ہے پس اس آیت سے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خلافت کے برحق ہونے کا بھی یقینی وقطعی علم حاصل ہو گیا۔ اور ان کے خلاف تمام مطاعن از خود کالعدم ہو گئے۔ اگر کہا جائے کہ یہ آیت حضرت علیؓ کے حق میں ہے کہ انہوں نے اپنے زمانۂ خلافت میں مرتدوں سے جنگ کی ہے تو جواب یہ ہے کہ حضرت علیؓ کا اہل شام کے متعلق یہ فرمان نہج البلاغہ میں موجود ہے جس میں صاف وضاحت اس امر کی ہے کہ اہل شام مومن بلکہ مومن کامل ہیں۔ حضرت علیؓ نے اس مضمون کا گشتی مراسلہ اپنے علاقوں میں بھیجا تھا:-

وکان بدء امرنا انا التقینا والقوم من اهل الشام والظاهر ان ربنا واحد و نبینا واحد و دعوتنا فی الاسلام واحدة و لانستزیدهم فی الایمان بالله والتصدیق برسوله ولایستزیدوننا فالامر واحد الاما اختلفنا فیه من دم عثمان و نحن منه براء (۳۸)

''یعنی ہمارے معاملے کی ابتدا یوں ہوئی کہ ہم میں اور اہل شام میں مقابلہ ہوا اور ظاہر ہے کہ ہمارا اور ان کا خدا ایک اور ہمارا اور ان کا نبی ایک اور ہماری اور ان کی دعوتِ اسلام ایک ہے۔ اللہ پر ایمان رکھنے میں اور اس کے رسول کی تصدیق میں نہ ہم ان سے کسی زائد چیز کا مطالبہ کرتے ہیں اور نہ ہی وہ ہم سے کسی زائد چیز کا مطالبہ کرتے ہیں تو معاملہ ایک ہی ہے سوائے اس کے کہ خونِ عثمانؓ کے معاملے میں ہمارا اختلاف ہوا ہے اور ہم اس (قتلِ عثمانؓ) سے بری ہیں''۔

جنگ جمل کے متعلق مورخین نے تصریح کر دی ہے کہ یہ جنگ فتنہ جو لوگوں کی شرارت سے ہوئی ورنہ فریقین میں مصالحت ہو چکی تھی۔ اس جنگ پر فریقین کو شدید صدمہ ہوا۔ حضرت عائشہؓ کی شان میں بدکلامی کرنے والے لوگوں کو حضرت علیؓ نے کوڑے لگوائے۔ حضرت زبیرؓ کے قاتل عمرو بن جرموز کو آپ نے جہنم کی بشارت سنائی وغیرہ سب امور ظاہر کرتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ اور دیگر اصحاب رسول کو جو حضرت عائشہؓ کی فوج میں شامل تھے، حضرت علیؓ مومن کامل گردانتے تھے (۳۹)۔ خوارج سے حضرت علیؓ کی جنگ نہروان ہوئی۔ خوارج کی گمراہی اگرچہ دینی گمراہی ہے لیکن حضرت علیؓ نے انہیں ہرگز کافر یا مرتد قرار نہیں دیا ورنہ آپ بچے کھچے خوارج کا بھی مکمل قلع قمع کرتے۔ ان کے خلاف آپ نے جنگ بھی مجبوراً کی جبکہ وہ بار ہا منع کرنے کے باوجود ناحق قتل وغارت سے باز نہیں آتے تھے۔ آپ نے ان میں سے کسی مرد کو غلام یا عورت کو لونڈی نہیں بنایا نہ ان کے مال کو مالِ غنیمت قرار دیا۔ نیز آیتِ ارتداد میں خطاب حاضرین سے ہے جب کہ اس وقت روئے زمین پر خوارج تھے ہی نہیں لہٰذا آیت کا تعلق خوارج کی گمراہی

سے نہیں۔ خوارج اسلام کی راہ سے یوں نکل گئے جیسے تیر کمان سے نکلتا ہے۔ لیکن ان کی یہ گمراہی ضلالِ بعید نہیں جو کفر تک پہنچ جائے۔ نیز اگر تسلیم کرلیا جائے کہ (معاذ اللہ) خلفائے ثلاثہ اور ان کے ساتھی مرتد تھے تو حضرت علیؓ نے ان کے خلاف جنگ کیوں نہیں کی حالانکہ آیت کے مضمون سے واضح ہے کہ اس آیت کے نزول کے وقت جو مسلمان بھی موجود تھے ان میں سے جب بھی کوئی مرتد ہوگا تو اس سے قتال ضرور ہوگا تو حضرت علیؓ بعض مرتدوں سے تو قتال کریں اور بعض سے قتال تو ایک طرف رہا، انہیں مفید مشورے دیں اور اپنے دور خلافت میں ان کے کاموں مثلاً تراویح کا اجرا، قرآن کریم کا لغتِ قریش میں پھیلانا، اموال فے اور باغ فدک میں ان کے طرز عمل وغیرہ کو بحال رکھیں تو کیسے کہا جا سکتا ہے کہ حضرت علیؓ نے اس آیت پر عمل فرمایا ہے؟ پس یہ مفروضہ ہی غلط ہے کہ یہ آیت صرف حضرت علیؓ کے حق میں ہے۔ نیز اس آیتِ میں مرتدین کے خلاف لڑنے والی جماعت کے جو اوصاف بیان کئے گئے ہیں حضرت علیؓ کے ان ساتھیوں پر ہرگز صادق نہیں آتے جن کی مذمت میں نہج البلاغۃ میں مذکور آپ کے خطبات بھرے پڑے ہیں۔ نیز آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قتال مرتدین میں وہ جماعت کامیاب ہوگی اور فتنۂ ارتداد کا قلع قمع ہو جائے گا لیکن سیدنا حضرت علیؓ کے دور میں ایسا نہیں ہوا۔

اگر کہا جائے کہ اس آیتِ کی پیشگوئی حضرت امام مہدی کے دور میں پوری ہوگی تو آیتِ میں خطاب حاضرین سے ہے اور لفظ ''منکم'' بتا رہا ہے کہ یہ پیشگوئی صرف زمانہ نزول کے لئے ہے اگر اس آیت کے مدلول کو عام کر دیا جائے تو لازم آئے گا کہ ہر دور میں جو لوگ بھی مرتد ہوں ان کے خلاف جہاد کرنے والی کوئی قوم اٹھا کرے گی حالانکہ یہ مشاہدے کے خلاف ہے۔ اگر بالفرض آیت کو زمانہ نزول کے ساتھ خاص نہ رکھیں تو بھی زمانہ نزول ضرور مراد ہوگا کیونکہ خطاب حاضرین سے ہو اور مراد غائبین لئے جائیں تو یہ بغیر کسی زبردست قرینے کے ہرگز درست نہیں اور یہاں کوئی ایسا قرینہ موجود نہیں ہے۔

مشہور شیعہ مفسر علامہ کاشانی نے اپنی تفسیر منہج الصادقین میں اس آیت کی تفسیر میں جو کچھ لکھا ہے اس کے ضروری اقتباسات درج ذیل ہیں:-

(۱) در تاریخ مذکور است کہ سیزدہ قبائل از اسلام مرتد شدند۔ سہ در آخر عہد رسول صلی اللہ علیہ وسلم ..... وقتل اسود در شب واقع شد کہ در صبح آں رسول خدا صلعم بجوار رحمتِ ایزدی پیوست.....

(۲) وبعد ازاں رسول خدا بیمار شد و بجوار ایزدی پیوست و کار مسیلمہ قوت گرفت و ابوبکر چوں بخلافت بنشست خالد بن ولید را با جماعتے بجانب خیبر فرستاد تا او را مقہور کردند.....

(۳) در عہد ابوبکرؓ ہفت قبیلہ مرتد شد..... حق تعالیٰ شر ایشاں را کفایت کرد و بر دست مسلماناں بقتل

آمدند...... در زمانہ عمرؓ غسان قوم جبلہ بن ایہم نصرانی شدہ...... نقل کردہ اند کہ آیت در بارہ ابوبکر و اصحاب او است کہ با اہل ردّہ کارزار کردند (۴۰)

(۱) ''تاریخ میں مذکور ہے کہ اسلام میں تیرہ قبیلے مرتد ہوئے جن میں سے تین رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری زمانے میں ہوئے...... اور اسود عنسی کا قتل اس رات کو واقع ہوا جس کی صبح رسول اکرم ﷺ نے انتقال فرمایا۔

(۲) اور اس کے بعد رسول خدا ﷺ بیمار ہوگئے اور انتقال فرما گئے۔ مسیلمہ نے قوت پکڑ لی۔ جب ابوبکرؓ خلیفہ ہوئے تو آپ نے خالد بن ولید کو ایک جماعت کے ساتھ خیبر کی جانب بھیجا یہاں تک کہ انہوں نے مسیلمہ کو مغلوب کر دیا۔

(۳) ابوبکرؓ کے دور میں سات قبیلے مرتد ہوئے...... اللہ تعالیٰ نے ان کے شر کو دور فرمایا اور یہ لوگ مسلمانوں کے ہاتھوں مقتول ہوئے...... عمرؓ کے زمانے میں جبلہ بن ایہم کی قوم غسان نصرانی ہوگئی...... (مفسرین ومؤرخین) بیان کرتے ہیں کہ یہ آیت ابوبکرؓ اور آپ کے ساتھیوں کے بارے میں ہے کہ انہوں نے مرتدین کے خلاف جنگ لڑی تھی''۔

مذکورہ بالا وضاحتوں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حدیث حوض کا مصداق یہی مرتدین ہیں جن کی خبر قرآن کریم میں آئی اور جن کے خلاف حضرت ابوبکر صدیقؓ اور دیگر صحابہ کرامؓ نے جہاد کیا۔ حدیثِ حوض کا مفہوم یہ ہے کہ حوض کوثر پر کچھ لوگ حاضر ہوں گے لیکن ملائکہ انہیں پیچھے دھکیل دیں گے رسول اکرم ﷺ فرمائیں گے یہ تو میرے اصحاب ہیں اس پر ملائکہ کہیں گے کہ آپ کو علم نہیں کہ آپ کے بعد ان لوگوں نے کیا کیا، ان مرتدین کے بارے میں صحیح بخاری میں کتاب الانبیاء ''باب نزول عیسیٰ بن مریم'' سے قبل مذکور ہے: (۴۱) **وهم المرتدون الذّين ارتدوّا علیٰ عهد ابی بكر، قاتلهم ابوبكر رضی الله عنه** ''یہ مرتدین (جن کا حدیث حوض میں ذکر ہے) وہی لوگ ہیں جو ابوبکر صدیقؓ کے دور خلافت میں مرتد ہوگئے تھے جن کے خلاف حضرت ابوبکرؓ نے قتال کیا''۔ فتح الباری شرح صحیح بخاری میں امام خطابیؒ کا قول نقل کیا گیا ہے'' **لم يرتد من الصحابة احد، وانما ارتدّ قوم من جفاة الا عراب ممن لانصرة له فی دين وذالک لايوجب قدحا فی الصحابة المشهورين، ويدل قوله أُصيحابی'' بالتصغير علیٰ قلّة عدد هم** (۴۲) ''صحابہ کرامؓ (مہاجرین وانصار اور مؤلفۃ القلوب قریش مکہ) میں سے کوئی بھی مرتد نہیں ہوا۔ البتہ اجڈ قسم کے بدوؤں کی ایک جماعت ضرور مرتد ہوئی، جن کی دین میں کوئی نصرت نہیں تھی اور یہ بات مشہور صحابہ میں موجب قدح نہیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

کا بصیغہ تصغیر اُصیحابی (میرے چند صحابی) فرمانا مرتدین کی تعداد کی قلت واضح کرتا ہے''۔

عام الوفود میں بعض عرب قبائل کے وفود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اسلام قبول کرلیا ان لوگوں نے کسی جہاد میں کوئی حصہ نہیں لیا تھا اور نہ ہی انہیں رسول اکرم ﷺ کی طویل صحبت اور تربیت حاصل ہوئی تھی یہ لوگ اپنے قبائل میں واپس گئے تو انہوں نے بھی دیکھا دیکھی اسلام قبول کرلیا۔ رسول اکرم ﷺ کے انتقال کے بعد کچھ لوگ جو عام الوفود میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے، مرتد ہوئے کچھ لوگوں نے مثلاً اسود عنسی اور مسیلمہ کذاب وغیرہ نے تو آپ کی حیات طیبہ میں ارتداد اختیار کیا۔ ان چند مرتدین کے قبائل کے دیگر افراد نے تو رسول اکرم ﷺ کو دیکھا تک بھی نہیں تھا اس لئے حدیث حوض کی مستند روایات میں ''اصیحابی'' بصیغہ تصغیر ہے۔ اگر خلفائے راشدین اور ان کے ساتھی مرتد ہوئے ہوتے تو آیت ارتداد کے تحت مغلوب ومقہور ہوتے نہ کہ ایسی زبردست امارت وخلافت کے مالک ہوتے جن کے آگے قیصر وکسریٰ کی متکبر گردنیں جھک گئیں۔

(د) بحوالہ آیت دعوتِ اعراب:-

سورۂ فتح میں ہے۔ قُلْ لِلْمُخَلَّفِيْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ سَتُدْعَوْنَ اِلٰى قَوْمٍ اُولِيْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ تُقَاتِلُوْنَهُمْ اَوْ يُسْلِمُوْنَ فَاِنْ تُطِيْعُوْا يُؤْتِكُمُ اللّٰهُ اَجْرًا حَسَنًا وَاِنْ تَتَوَلَّوْا كَمَا تَوَلَّيْتُمْ مِّنْ قَبْلُ يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا (۴۳) ''(اے پیغمبر!) تو (غزوہ حدیبیہ سے) پیچھے رہ جانے والے اعراب (بدوں) سے کہہ دے کہ عنقریب تمہیں ایک نہایت سخت جنگ جو قوم کے خلاف (لڑنے کے لئے بلایا جائے گا کہ تم ان سے جنگ لڑو گے یا وہ مسلمان ہو جائیں گے (یا جزیہ ادا کر کے مطیع ہو جائیں گے) تو اگر تم نے (بلانے والے کی) اطاعت کی تو اللہ تمہیں عمدہ اجر دے گا اور اگر تم نے منہ پھیرا جیسے پہلے پھیرا تھا تو وہ تمہیں دردناک عذاب دے گا''۔

آیت مذکورہ بالا میں روئے سخن بالاتفاق ان بدو قبائل کی طرف ہے جنہوں نے غزوۂ حدیبیہ میں رسول اکرم صلی اللہ وسلم کا ساتھ نہیں دیا تھا اور صلح نامہ حدیبیہ ہو جانے کے بعد اپنی اس کوتاہی پر جھوٹے بہانے پیش کئے تھے۔ یہ لوگ غزوۂ خیبر میں شریک ہونے پر آمادہ تھے لیکن ان کی اس پیشکش کو قبول نہیں کیا گیا اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ سَيَقُوْلُ الْمُخَلَّفُوْنَ اِذَا انْطَلَقْتُمْ اِلٰى مَغَانِمَ لِتَاْخُذُوْهَا ذَرُوْنَا نَتَّبِعْكُمْ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّبَدِّلُوْا كَلٰمَ اللّٰهِ قُلْ لَّنْ تَتَّبِعُوْنَا كَذٰلِكُمْ قَالَ اللّٰهُ مِنْ قَبْلُ الاية (۴۴) ''یعنی عنقریب یہ پیچھے رہ جانے والے (بدو) جب تم غنائم حاصل کرنے کے لئے (غزوہ خیبر کے لئے) چلو گے،

کہیں گے کہ ہم بھی تمہارے ساتھ چلیں گے۔ وہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے کلام (فیصلے) کو بدل دیں (اے پیغمبر!) ان سے کہہ دے کہ تم ہرگز ہمارے ساتھ نہیں جاؤ گے اللہ تعالیٰ نے پہلے سے ہی یہ کہہ رکھا ہے''۔

یہ بدو قبائل اگرچہ قصوروار تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان پر یہ مہربانی فرمائی کہ انہیں اپنی اصلاح کا موقع فراہم کیا اور ان سے کہا گیا کہ فی الحال تو تم مسلمانوں کے ساتھ جہاد کے لئے نہیں جاؤ گے لیکن عنقریب تمہیں ایک اور جنگجو قوم کے خلاف دعوتِ جہاد دی جائے گی۔ صلح نامہ حدیبیہ کے بعد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں صرف چار غزوات ہوئے غزوہ خیبر، غزوہ فتح مکہ، غزوہ حنین اور غزوہ تبوک۔ غزوۂ خیبر اور غزوۂ حنین و ہوازن میں مسلمانوں کو غنیمتیں حاصل ہوئیں لیکن غنیموں والے غزوات میں ان بدو قبائل کو شرکت کی اجازت ہی نہیں تھی پھر غزوہ حنین کی غنیمتیں آپ نے مہاجرین وانصار کو نہیں دیں بلکہ مؤلفۃ القلوب نومسلم قریش مکہ کو دیں۔ ان بدّو قبائل کا درمیان میں کہیں ذکر ہی نہیں۔ غزوۂ فتح مکہ میں معمولی سی جھڑپ کے علاوہ کوئی جنگ ہی نہیں ہوئی اور غزوۂ تبوک میں دشمن مقابلے کے لئے نکلا ہی نہیں۔ زیر بحث آیت میں یہ بھی ہے کہ یا تم اس سخت جنگ جو قوم سے لڑو گے یا وہ مسلمان ہو جائیں گے (یُسلمون) اگر اسلام کو لغوی معنی میں لیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ وہ تمہاری اطاعت قبول کرلیں گے جس کی صورت یہ ہوگی کہ وہ جزیہ ادا کریں گے۔ حضرت علیؓ کے دور خلافت میں ایسی کوئی صورت پیش نہیں آئی۔ اگر آیت ''یُسلمون'' سے اسلام شرعی مراد لیا جائے تو اشارہ ان مرتدین کی طرف ہے جنہوں نے نبوت کا جھوٹا دعویٰ کیا یا زکوٰۃ کی ادائیگی سے منحرف ہوئے یا اسلام کو چھوڑ کر اپنے آبائی مشرکانہ مذہب پر چلے گئے چونکہ مرتدین سے جزیہ نہیں لیا جاتا تو یا وہ مقتول ہونگے یا از سر نو اسلام قبول کریں گے اس لئے آیت میں ہے ''تقاتلو نهم اويسلمون''۔ اس صورت میں آیت دعوت اعراب میں ''سخت جنگ جو قوم'' کا مطلب یہ ہوا کہ یہ قریش مکہ نہیں ہونگے بلکہ دوسری کوئی قوم ہوگی۔ کیونکہ ان اعراب (بدوؤں) کو غزوۂ حدیبیہ میں قریشِ مکہ کے بالمقابل ہی تو مدعو کیا گیا تھا لہٰذا اب یہاں ''قوم'' سے دوسرے لوگ ہی مراد ہو سکتے ہیں۔ الغرض ہر صورت میں یہ تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں کہ ان بدو قبائل کو مرتدین کے خلاف یا روم وایران کی نہایت طاقتور حکومتوں کے خلاف جنگ کی دعوت خلفائے ثلاثہ کے عہد میں ہی دی گئی۔ مرتدین میں سے بھی بعض سخت جنگ جو تھے مثلاً مسیلمہ کذاب کے خلاف جہاد میں بہت سے مسلمان شہید ہوئے تھے۔ اگر کہا جائے کہ ان بدو قبائل کو دعوتِ جہاد سرے سے دی ہی نہیں گئی تو اس سے قرآنی پیشگوئی (معاذ اللہ) غلط ثابت ہوگی پس ان اعراب کو خلفا ثلاثہ کے دور میں دعوتِ جہاد دی گئی اور قرآنی وعدہ کے مطابق یہ لوگ عمدہ اجر کے بھی مستحق ہوئے اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ ان اعراب نے نفاق چھوڑ کر سچے

دل سے اسلام قبول کرلیا تھا ورنہ منافق تو کافر ہوتا ہے اس سے اللہ اچھے اجر کا وعدہ نہیں کرتا۔ سورۂ فتح میں اسی سلسلۂ آیات میں یہ بھی فرمایا گیا تھا۔ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (۴۵) ''آسمانوں اور زمین کی حکومت اللہ ہی کے لئے ہے وہ جسے چاہے بخش دے اور جسے چاہے عذاب دے اور اللہ بڑا بخشنے والا نہایت مہربان ہے''۔ اس آیت میں بھی اشارہ فرمادیا گیا تھا کہ یہ اعراب بالآخر مغفور ومرحوم ہوں گے۔ آیت دعوتِ اعراب سے یہ واضح ہورہا ہے کہ جولوگ انہیں دعوتِ جہاد دیں گے، ان کی اطاعت پر اللہ اجر دے گا اور ان کی نافرمانی پر اللہ دردناک عذاب دے گا۔ اب جبکہ یہ ثابت ہوچکا کہ ان اعراب کو دعوت جہاد خلفائے ثلاثہ نے دی تھی تو یہ بھی ثابت ہوگیا کہ یہ خلفا اللہ کے محبوب ہیں اور خلفائے راشدین کے مجموعی مسلک کا اتباع واجب ہے۔ ان سے ان کے معاصرین یعنی ہم زمانہ مسلمانوں کا اختلاف انتظام وتدبیر کے معاملے میں ہوسکتا ہے دین میں ہرگز نہیں ہوسکتا۔ جب یہ خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم اللہ کے محبوب ہیں تو ان کے خلاف تمام مطاعن ومثالب کالعدم ہوجاتے ہیں۔

(ھ) بحوالہ آیتِ استخلاف:-

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْئًا وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ (۵۵) اللہ نے تم (لوگوں میں سے) ایمان لانے والوں اور نیک عمل کرنے والوں سے وعدہ کرلیا ہے کہ وہ انہیں ضرور بالضرور زمین میں خلیفہ بنائے گا جیسا کہ ان لوگوں کو خلیفہ بنایا تھا جو ان سے پہلے تھے اور ضرور بالضرور ان کے لئے ان کے دین کو غالب کرے گا جو اس نے ان کے لئے پسند کرلیا ہے اور ضرور بالضرور ان کے (موجودہ) خوف کو امن سے بدل دے گا۔ وہ میری عبادت کرتے ہیں اور میرے ساتھ کسی اور کو شریک نہیں بناتے اور جو شخص اس کے بعد کفر کرے یا (ناشکری کرے) تو یہی وہ لوگ فاسق ہیں''۔

آیت مذکورہ بالا میں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو مخاطب فرمایا ہے جو نزول آیت کے موقع پر موجود تھے کہ ان میں سے جو لوگ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاچکے ہیں اور نیک اعمال کی دولت سے مالا مال ہیں ان سے ہمارا نہایت پختہ وعدہ ہے کہ ہم ان کو زمین میں خلافت دیں گے جیسا کہ ان سے پہلے

بنی اسرائیل کو ملی تھی دوسرا وعدہ یہ ہے کہ اللہ ان کے لئے دین اسلام کو نہایت مضبوط اور مستحکم کرے گا کیونکہ اللہ نے یہ دین ان کے لئے پسند کرلیا ہے تیسرا وعدہ یہ ہے کہ اللہ ان کے دشمنوں کو مغلوب ومقہور کردیگا کہ کسی دشمن کا خوف انہیں دامن گیر نہ ہوگا بلکہ امن کامل حاصل ہوگا۔ کیونکہ یہ لوگ میری عبادت کرتے ہیں اور میرے ساتھ عبادت میں کسی کو شریک نہیں ٹھہراتے ان کے یہ اوصاف انہیں خلافت وامارت ملنے کے بعد بھی متغیر نہ ہونگے کہ سلطنت وحکومت کے نشے میں اللہ سے غافل ہوجائیں۔ ان تمام باتوں کے جان لینے کے بعد کوئی کفر کرے خواہ یہ حقیقی کفر ہو جو اسلام کی ضد ہے یا ناشکری سے کام لیتا ہو ان خلفا کی دینی خدمات، اسلام اور مسلمانوں پر ان کے لازوال احسانات کو فراموش کردے یا ان کے متعلق بدظنی سے کام لینے لگے تو یہ لوگ فاسق وفاجر ہونگے۔ یاد رہے کہ اس کفر کی نسبت معاذ اللہ ان خلفا کی طرف نہیں ورنہ علام الغیوب اللہ تعالیٰ ان کی مدح ہی کیوں فرماتا اور ان کو بشارتیں کیوں دیتا اور ان سے پختہ اور تاکیدی وعدے کیوں کرتا؟ بلکہ اس کی نسبت ان لوگوں کی طرف ہے جو کفر اختیار کریں۔ جو ان خلفائے راشدین کی ناشکری کریں آج دنیا میں جہاں جہاں بھی مسلمان موجود ہیں انہیں غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ انہیں کرۂ ارض پر جو ٹھکانا ملا ہوا ہے اس کی پشت پر خلفائے راشدین کی وہ فتوحات ہیں جن سے اسلامی سرحدیں میں نہایت وسیع وعریض علاقے کو اپنے اندر سموئے ہوئے تھیں۔ جن کی وجہ سے دین اسلام کو استحکام حاصل ہوا نظریاتی اور جغرافیائی دونوں قسم کی سرحدوں کو تحفظ حاصل ہوا۔

آیت میں ''منکم'' کی ضمیر مخاطب سے واضح ہوگیا کہ یہ وعدہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرامؓ سے ہے کیونکہ جب حاضرین مخاطب ہوں تو اس خطاب میں غائبین کو کسی قرینہ اور دلیل کے بغیر شامل نہیں کیا جاسکتا۔ دین کے اصول وفروع چونکہ قیامت تک سب لوگوں کے لئے ہیں لہذا اس قرینہ کی بنا پر دینی اوامر ونواہی میں صحابہ کرامؓ کو بصیغہ خطاب بھی مخاطب کیا گیا ہو تو بعد والے مسلمان بھی اس خطاب میں شامل ہوں گے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اصل حاضرین اس خطاب سے خارج ہوجائیں۔ آیت استخلاف میں تو خاص خطاب ہی صحابہ کرامؓ کے لئے ہے کیونکہ نزول آیت کے وقت کرۂ ارض پر موجود لوگوں میں ایمان اور اعمال صالحہ کی نعمت صرف انہیں حاصل تھی۔ آیت میں چونکہ خلافت فی الارض کا وعدہ ہے تو الارض (زمین)'' کے لفظ نے واضح کردیا کہ یہ خلافت محض روحانی اور معنوی جانشینی نہیں ہوگی بلکہ ان خلفا کو زمین پر تصرف حاصل ہوگا یہ حاکم ہوں گے تو یہاں خلافت میں دینی روحانی پیشوائی کے ساتھ ساتھ امارت وحکومت بھی شامل ہے۔ قرآن کریم میں جہاں بھی خلافت فی الارض اور تمکین فی الارض کی

بات ہوئی ہے تو اس میں یقیناً امارت وحکومت بھی شامل ہے جیسا کہ قبل ازیں آیتِ تمکین کے مفہوم و مدلول سے بھی ثابت ہو چکا ہے۔ آیت میں دین کے غلبے سے صرف دلائل کا غلبہ ہی مراد نہیں بلکہ سیاسی اور عسکری غلبہ بھی یقیناً مراد ہے ورنہ دلائل کی رو سے تو حق کبھی مغلوب ہوتا ہی نہیں۔ آیت میں یہ مضمون کہ اللہ ان خلفا کے خوف کو امن سے بدل دے گا، صاف ظاہر کرتا ہے کہ یہاں سیاسی اور عسکری غلبہ بھی مراد ہے کہ یہ خلفا اور ان کے تحت تمام مسلمان اپنے دشمنوں پر غالب ہونگے۔ دشمن ان سے مرعوب اور خوف زدہ ہوگا وہ دشمنوں سے مرعوب نہیں ہوں گے ان کو امن حاصل ہوگا۔ امن حاصل ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ انہیں موت نہیں آئے گی یا یہ شہید نہ ہوں گے ورنہ (معاذ اللہ) یہ کہنا پڑے گا کہ جو خلفا بشمول سیدنا حضرت علیؓ مقتول ہو کر مرتبۂ شہادت پر فائز ہوئے ہیں ان میں سے کسی کو بھی امن حاصل نہ تھا اور وہ دشمنوں سے مرعوب اور خوف زدہ رہتے تھے۔ اگر اس مفروضے کو تسلیم کر لیا جائے تو پھر اللہ تعالیٰ کے یہ نہایت پختہ اور تاکیدی وعدے اور بشارتیں کس کے حق میں پوری ہوئیں؟ اگر کہا جائے کہ یہ امام مہدیؓ کے دور میں پوری ہوں گی تو اول تو ہمارے امامیہ بھائیوں کے خیال میں حکمرانوں کے خوف سے امام مہدیؓ غار میں روپوش ہو گئے تھے اور ابھی تک ان کا ظہور نہیں ہوا حالانکہ آیت میں تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان خلفا کے خوف کو امن سے بدل دے گا۔ دوسری بات یہ ہے کہ آیت میں ''منکم'' کے لفظ نے خطاب کو حاضرین کے ساتھ مخصوص کیا ہے اور حضرت امام مہدیؓ تو نزول آیت کے موقع پر سرے سے کرہ ارض پر موجود ہی نہ تھے۔ اگر کہا جائے کہ وعدۂ استخلاف رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں ہی پورا ہو گیا تھا غزوۂ خیبر، غزوۂ فتح مکہ اور غزوۂ تبوک سے دین کو غلبہ حاصل ہو گیا تھا اور خطۂ عرب میں مسلمانوں کی حکومت بھی قائم تھی تو جواب یہ ہے کہ غزوۂ خیبر کے بعد بھی مکہ پر اور دیگر عرب علاقوں پر کفار کا قبضہ تھا۔ مکہ مکرمہ رمضان المبارک ۸ ہجری میں فتح ہوا تو ۹ ہجری میں ہی غزوۂ تبوک پیش آ گیا دشمن نہایت طاقتور، سفر دور دراز کا اور کھجوروں کی فصل پکی ہوئی تھی منافقین تو ایک طرف رہے بعض مخلص مسلمان بھی غزوہ میں شرکت سے گھبرا رہے تھے جیسا کہ آیت غار کے مباحث کے ضمن میں ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ پھر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ربیع الاول ۱۱ ہجری میں رحلت فرما گئے تو اتنے مختصر سے عرصہ کے لئے مذکورہ آیت استخلاف کی نہایت پختہ اور شد و مد سے دی گئی بشارت کیا معنی رکھتی ہے؟ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاۃ طیبہ میں ہی فتنہ ارتداد نے سر اٹھانا شروع کر دیا تھا اور آپ کے انتقال پر تو جھوٹے مدعیان نبوت نے امن وامان اور دین کے استحکام کو سخت خطرے میں ڈال رکھا تھا نیز قرآن کریم میں ہے۔ وَاِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ

الَّذِیْ نَعِدُھُمْ اَوْ نَتَوَفَیَنَّکَ فَاِلَیْنَا مَرْجِعُھُمْ ثُمَّ اللّٰہُ شَھِیْدٌ عَلٰی مَایَفْعَلُوْنَ (۱۰/۴۷) ''یعنی ہم جن چیزوں کا ان سے وعدہ کررہے ہیں ان میں سے کچھ چیزیں تو ہم تجھے تیری زندگی ہی میں دکھادیں گے یا ہم تیری جان قبض کرلیں گے تو ان سب کا لوٹنا بھی ہمارے پاس ہی ہوگا پھر اللہ جو کچھ بھی وہ کرتے ہیں اس پر گواہ ہے''۔ آیت سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کے لئے کوئی وعدہ یا بشارت ہو یا کفار کے لئے کوئی وعید ہو تو ضروری نہیں کہ یہ رسول اکرم ﷺ کی حیات طیبہ ہی میں ظاہر ہو بلکہ کچھ وعدے اور کچھ وعیدیں آپ کے انتقال کے بعد ظاہر ہوں گی مسلمانوں سے غلبے کا وعدہ بالفاظ دیگر کفار کے لئے وعید ہے چنانچہ آیتِ استخلاف میں مسلمانوں کی عظیم الشان امارت وخلافت اور کفار کی مغلوبیت ومرعوبیت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے بعد اعلیٰ درجے پر ظاہر ہوئی گو غلبۂ اسلام کے آثار خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں ظاہر ہونے لگے تھے۔ آیت استخلاف میں ہے کہ اللہ خلیفہ بنائے گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسے اسباب ظاہر ہونگے کہ خلفائے راشدین کو خلافت حاصل ہوجائے گی یہ مطلب نہیں کہ آسمان سے فرشتے اتر کر کسی کو تختِ خلافت پر بٹھائیں گے بشمول سیدنا حضرت علیؓ تمام خلفائے راشدینؓ کا انتخاب عام اسباب کے تحت مہاجرین وانصار ہی نے کیا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ کی طرف سے حضرت عمرؓ کی خلافت کے لئے نامزدگی بھی عام اسباب کے تحت ہوئی اور مہاجرین وانصار اس پر راضی تھے۔ چونکہ اسباب کا خالق اللہ تعالیٰ ہے اور وہی ان اسباب کو مؤثر بناتا ہے لہذا عام لسانی محاورات میں لوگوں کے کاموں کی نسبت اللہ کی طرف کردی جاتی ہے قرآن کریم میں بھی لسانی محاورات کے مطابق لوگوں کے عام کاموں کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب فرمایا ہے مثلاً ارشاد ہے۔ وَجَعَلَ لَکُمْ مِّنَ الْفُلْکِ وَالْاَنْعَامِ مَا تَرْکَبُوْنَ (۱۲/۴۳) ''اس نے تمہارے لئے کشتیاں اور مویشی بنائے جن سے تم سواری کا کام لیتے ہو''۔ دیکھئے کشتیاں تو بظاہر انسان ہی بناتے ہیں لیکن انسانوں کا، ان کی صلاحیتوں کا، کشتی کے مادہ اور مواد کا اور دیگر تمام متعلقہ اسباب کا خالق اللہ تعالیٰ ہی ہے لہذا کشتیاں بنانے کی نسبت اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف فرمائی ہے۔ یا مثلاً غزوۂ بنونضیر کے یہودیوں کے متعلق اللہ تعالیٰ کا سورۂ حشر میں ارشاد ہے۔ فَاَتٰھُمُ اللّٰہُ مِنْ حَیْثُ لَمْ یَحْتَسِبُوْا (۵۹/۲) اللہ ان کے پاس ایسی جگہ سے آیا جس کا انہیں گمان تک نہ تھا''۔ دیکھئے یہودیوں کا محاصرہ تو بظاہر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب نے کیا تھا لیکن ان کے اس فعل کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب فرمایا ہے۔ کیونکہ ان کا یہ فعل اللہ تعالیٰ کے نزدیک نہایت پسندیدہ ہے۔ اسی طرح جن مہاجرین وانصار نے عام اسباب کے تحت خلفائے راشدین کا

انتخاب کیا۔ عام اسباب کے تحت ان کا یہ فعل اللہ تعالیٰ کے ہاں اس قدر پسندیدہ ہے کہ اس کی نسبت اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف کرتے ہوئے وعدہ اور بشارت میں یہ فرمایا کہ اللہ انہیں خلیفہ بنائے گا یعنی یہاں اللہ تعالیٰ کی طرف یہ اضافت ونسبت محض اس لئے نہیں کہ اللہ تعالیٰ مسبب الاسباب ہے بلکہ اس لئے بھی ہے کہ خلفا کے اس انتخاب وتقرر کا شرف ظاہر کرنا بھی مقصود ہے۔ آیت استخلاف میں جو وعدہ اور بشارت کا مضمون ہے اس میں اللہ تعالیٰ نے کسی کا نام نہیں لیا ہے بلکہ نزول آیت کے موقع پر لوگوں کو معلوم نہ تھا کہ کون حضرات اس آیت کا مصداق بنیں گے یہ تو بعد کے حالات سے لوگوں کو پتہ چلا کہ خلفائے اربعہ حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان ذوالنورین، اسد اللہ الغالب علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہم اس آیت استخلاف کا مصداق ہیں۔ اسی معنی میں کہا جاتا ہے کہ خلافت منصوص من اللہ نہیں ہوتی یعنی اللہ تعالیٰ خلیفہ کو نامزد کر کے لوگوں کو مطلع نہیں کرتا۔ یہاں بنی اسرائیل کے بادشاہ طالوت کی مثال اس لئے خارج از بحث ہے کہ لوگوں نے خود اپنے نبی سے یہ درخواست کی تھی کہ ہمارے لئے کوئی بادشاہ مقرر کر دیجئے اس طرح کی کوئی صورتِ حال رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں پیش نہیں آئی کہ لوگوں نے آپ سے کسی کو خلیفہ نامزد کرنے کی کوئی درخواست کی ہو۔ جیسا کہ آیت تمکین کے مباحث میں واضح کیا جا چکا ہے کہ بعض بشارتیں اور نعمتیں گو خاص شخص یا اشخاص کے لئے ہوتی ہیں لیکن چونکہ ان کا فائدہ پوری جماعت یا قوم کو پہنچتا ہے اس لئے ان نعمتوں کی نسبت سب کی طرف کر دی جاتی ہے۔ آیتِ استخلاف میں چونکہ بشارتیں اور وعدے ان کے لئے ہیں جو ایمان اور اعمال صالحہ کی صفت سے موصوف ہوں لہذا خلفائے راشدین کی زمنی ترتیب میں مسابقت کا پہلو بھی موجود ہے ورنہ کسی کا پہلے آنا اور کسی کا بعد میں آنا فی نفسہ (بذایت خود) زیادہ اہمیت کا حامل نہیں۔ چونکہ اس مسابقت سے خلفائے راشدین کی یہ ترتیب بامعنی ہوگئی اس لئے سواد اعظم اہل سنت کے نزدیک خلفائے راشدینؓ اسی ترتیب کے مطابق دیگر تمام صحابہ کرامؓ سے افضل ہیں۔ چنانچہ خلفائے راشدین عشرہ مبشرہ میں بھی شامل ہیں یعنی ان دس صحابیوں میں شامل ہیں جنہیں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نام لے کر جنتی قرار دیا ہے۔ قرآن کریم کی رو سے تو سب کے سب اصحاب رسول جنتی ہیں، مغفور مرحوم ہے مگر قرآن کریم میں ان کے اسماء گرامی مذکور نہیں بلکہ اوصاف وعلامات مذکور ہیں۔ جبکہ عشرہ مبشرہ کے اسمائے گرامی رسول اکرم ﷺ نے بیان فرما دیئے لہذا ان کا مقام ومرتبہ دیگر اصحاب سے اونچا ہے اور ان میں خلفائے راشدینؓ افضل ترین ہیں۔ آیتِ استخلاف کی موعودہ خلافت کو اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی خلافت سے تشبیہ دی ہے۔

بنی اسرائیل میں خلافت انبیاء کو ملتی تھی بنی کا خلیفہ عموماً نبی ہی ہوتا تھا رسول اکرم ﷺ خاتم النبین ہیں اس لئے خلفائے راشدینؓ کی خلافت انبیاء کی خلافت تو نہیں لیکن ہم رنگِ نبوت ضرور ہے اس لئے ان کی خلافت کو خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کہا جاتا ہے۔ نیز اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو عظیم الشان حکومت دی تھی خلفائے راشدین کو بھی بہت بڑی مملکت اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی۔ بنی اسرائیل کی خلافت سے باتفاق مفسرین حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خلافت مراد ہے ان کے بعد ان کے تین خلفا بڑی شان وشوکت والے تھے حضرت یوشع، حضرت کالب اور حضرت یوساقوس۔ ان خلفائے بنی اسرائیل کی فتوحات اور ان کے حالات خلفائے راشدین میں سے پہلے تین خلفا سے خاصے ملتے جلتے ہیں۔ بعض مفسرین نے حضرت داؤد علیہ السلام کی خلافت مراد لی ہے جن کے بعد ان کے صاحبزادے حضرت سلیمان علیہ السلام خلیفہ ہوئے ان کی حکومت کی قوت وشوکت، رعب اور دبدبہ ضرب المثل ہے یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ دونوں مراد ہوں۔

اگر کہا جائے کہ آیت استخلاف کا مصداق صرف سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں تو اس مفروضے کو ماننے کی صورت میں یہ تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں کہ حضرت علیؓ نے خلفائے ثلاثہؓ کے کاموں مثلاً باجماعت نماز تراویح، اذان واقامت کے کلمات، متعہ (نام نہاد عارضی نکاح) کی بندش، اموالِ فے (باغ فدک وغیرہ) میں ان کا طرزِ عمل، قرآن کریم کی لغت قریش پر جمع وتدوین اور اس کی نشر واشاعت کے ساتھ باقی نسخوں پر پابندی وغیرہ، سب کو بحال رکھا۔ اگر یہ کام خلافِ شرع ہوتے تو آیت استخلاف کی رو سے حضرت علیؓ کو استحکام اور تمکین بھی حاصل تھی اور آیت تمکین کی رو سے جسے تمکین اور غلبہ حاصل ہو وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا بھی پابند ہوتا ہے، پس اگر خلفائے ثلاثہ برحق نہ ہوتے اور ان کے کام خلافِ شرع ہوتے تو سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ یقیناً ان کی اصلاح کرتے، یہاں یہ عذر صحیح نہیں کہ انہوں نے ان کاموں کو خلافِ شرع تو قرار دیا تھا لیکن وہ کسی کو مجبور نہیں کرتے تھے اور کچھ نہیں تو وہ قرآن کریم کی صحیح ترتیب وتدوین کے تو پابند تھے اور باغ فدک بطور میراث حضرات حسنینؓ کو ضرور عطا فرماتے۔ اگر کہا جائے کہ انہیں خلافت تو حاصل تھی لیکن تمکین اور غلبہ حاصل نہ تھا تو اس صورت میں آیت استخلاف اور آیت تمکین کا مصداق انہیں کیسے ٹھہرایا جائے گا حالانکہ ان دونوں آیات میں مستحکم اور مضبوط خلافت و امارت کا ذکر ہے۔ پس یہ مفروضہ ہی غلط ہے۔ آیت استخلاف کا مصداق چاروں خلفائے راشدین ہیں، ان میں کوئی تفریق نہیں۔ سیدنا حضرت علیؓ کو اپنے دور خلافت میں تمکین اور استحکام اس معنی میں حاصل تھا کہ مسلمانوں کی باہم لڑائی کے باوجود کفار ان سے مغلوب ومرعوب تھے۔ نیز اگر آیت استخلاف، آیتِ

تمکین اور دیگر متعلقہ یا غیر متعلقہ قرآنی آیات سے یہ نتیجہ اخذ کیا جائے کہ ان کا مصداق صرف حضرت علیؓ ہیں تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قرآنی آیات اور بعض صورتوں میں ان آیات کے ساتھ احادیث وروایات کو ملانے سے حضرت علیؓ کا خلافت کے لئے صرف استحقاق ثابت ہوتا ہے یا اللہ تعالیٰ نے ان سے اس خلافت وامارت کا وعدہ بھی فرمایا تھا؟ پہلی شق اس لئے صحیح نہیں کہ آیتِ استخلاف میں صرف استحقاقِ خلافت کی بشارت نہیں بلکہ خلافت دینے اور خلیفہ بنانے کا پختہ وعدہ بھی ہے۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت علیؓ سے مطلق خلافت کا وعدہ تھا یا خلافت بلافصل کا وعدہ تھا؟ اگر پہلی شق اختیار کی جائے تو ہمیں اس سے سو فیصد اتفاق ہے واقعی سیدنا حضرت علیؓ کو دیگر خلفائے راشدین کی طرح آیتِ استخلاف کے تحت خلافتِ راشدہ عطا ہوئی ہے۔ دوسری شق اختیار کی جائے یعنی یہ کہا جائے کہ سیدنا حضرت علیؓ سے وعدہ خلافت بلافصل تھا تو اس شق کا غلط ہونا بالکل واضح ہے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ خلیفہ ہوئے ہیں نہ کہ کوئی اور۔ اللہ تعالیٰ ہرگز اپنے وعدہ کے خلاف نہیں کرتا اگر ایسا کوئی وعدہ سیدنا حضرت علی سے ہوتا تو ضرور بالضرور پورا ہوتا۔ یہاں خلیفہ اول اور خلیفہ بلافصل میں لطیف فرق کو بھی ملحوظ رکھنا چاہئے۔ اگر ہمارے بھائیوں نے سیدنا حضرت علیؓ کو خلیفہ اول قرار دیا ہوتا تو بھی یہ کہنا ہرگز درست نہ ہوتا کہ (معاذ اللہ) پہلے تین خلفا کی خلافت جائز نہیں تھی اس لئے انہیں کالعدم قرار دیتے ہوئے حضرت علی ہی کو خلیفہ اول سمجھا جائے۔ اللہ کسی کو خلیفہ اول بنانے کا وعدہ کرے تو درمیان میں نام نہاد غاصب خلفا کیسے گھس سکتے ہیں اللہ وعدہ پورا کرنے پر قادر مطلق ہے۔ ہمارے بھائی تو آپ کو خلیفہ بلافصل قرار دیتے ہیں ''بلافصل'' کا مطلب ہے کہ درمیان میں کوئی وقفہ نہیں۔ اب اگر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت علیؓ کے درمیان اور خلفا بھی آ جائیں خواہ ان کی خلافت درست ہو یا (معاذ اللہ) غلط ہو تو کسی بھی صورت میں حضرت علیؓ کی خلافت نفس الامر میں خلافت بلافصل نہ ہوئی، اگر اللہ تعالیٰ کا آپ سے ایسا کوئی وعدہ ہوتا تو ضرور بالضرور پورا ہوتا، پس ثابت ہوا کہ آیتِ استخلاف کا مصداق چاروں خلفائے راشدین ہیں، اللہ کا وعدہ پورا ہوا اور وہ اپنے اپنے مقام پر خلافت راشدہ پر فائز ہوئے۔ ان میں تفریق کی کسی بھی کوشش کو قرآن ناکام بنا دیتا ہے یہ خلفائے راشدین کی کرامت ہے۔

اب ہم اپنے اس موقف کی تائید میں کہ آیت استخلاف کا مصداق خلفائے راشدینؓ ہیں، اپنے امامیہ بھائیوں کی کتب سے بعض اقتباسات پیش کرتے ہیں۔

شیعہ مفسر علامہ فتح اللہ کاشانی اپنی تفسیر منہج الصادقین میں آیتِ استخلاف کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:- ودراندک فرصتے حق تعالیٰ بوعدۂ مومناں وفانمودہ جزائرعرب ودیارِ کسریٰ وبلادِ روم بدیشاں ارزانی داشت (۴۹) یعنی اللہ تعالیٰ نے مومنوں سے اپنا وعدہ تھوڑے ہی عرصے میں پورا کردیا۔ عرب کے جزائر، کسریٰ کے علاقے اور روم کے شہر انہیں عطا فرمائے''۔

شیعہ مفسر ابوعلی طبرسی اپنی تفسیر مجمع البیان میں آیت استخلاف کے متعلق تحریر فرماتے ہیں۔ لیستخلفنهم والمعنیٰ لیور ثنهم ارض الکفار من العرب والعجم فیجعلهم سُکا نها و ملوکها (۵۰) یعنی اللہ تعالیٰ ان کو عرب وعجم کے کفار کے علاقوں کا ضرور بالضرور وارث بنائے گا پس وہ ان میں رہیں گے اور ان علاقوں کے بادشاہ ہونگے۔

شیعہ مفسر علامہ محمد حسین طباطبائی اپنی تفسیر المیزان فی تفسیر القرآن میں آیتِ استخلاف کے سلسلہ میں تحریر فرماتے ہیں:-انها (آیة الاستخلاف) واردة فی اصحاب النبی صلی الله علیه وسلم و انجز الله وعده لهم باستخلافهم فی الارض و تمکین دینهم و تبدیل خوفهم امناً بما اعز الاسلام بعد رحلة النبی فی ایام الخلفاء الرشدین والمراد باستخلافهم استخلاف الخلفاء الاربعة بعد النبی صلی الله علیه وسلم او الثلاثة الاوّل منهم ونسبة الاستخلاف الی جمیعهم مع اختصاصه ببعضهم وهم الاربعة او الثلاثة من قبیل نسبة امر البعض الی الکل کقو لهم قتل بنو فلان (۵۱)'' یہ آیت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کے بارے میں نازل ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے حق میں اپنا وعدہ یوں پورا فرمایا کہ انہیں زمین کی خلافت دی، ان کے دین کو استحکام بخشا اور ان کے خوف کو امن سے بدل دیا اس لئے کہ اس نے اسلام کو عزت بخشی۔ یہ سب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد خلفائے راشدین کے دور میں ہوا۔ استخلاف سے مراد خلفائے اربعہ کا یا خلفائے ثلاثہ کا نبی کریم ﷺ کے بعد خلیفہ بننا ہے۔ تمام (اصحاب) کی طرف خلافت کی نسبت باوجود اس کے کہ اصل خلفا تو چار یا تین تھے (جو آیت استخلاف کا مصداق ہوئے) اس طرح ہے جیسے بعض لوگوں کے معاملے کو کل یعنی پوری جماعت کی طرف منسوب کردیا جائے۔ جیسے کہا جاتا ہے کہ فلاں قوم نے قتل کیا (حالانکہ سب لوگ قتل نہیں کرتے)''۔

غزوہ روم کے متعلق حضرت عمرؓ نے سیدنا حضرت علیؓ سے مشورہ کیا تھا کہ میں بذاتِ خود اس میں شریک ہونا چاہتا ہوں تو نہج البلاغۃ کی عبارت کے مطابق حضرت علیؓ کے تفصیلی جواب کا ایک حصہ یہ بھی

تھا قد توکل اللہ لاھل ھذا الدین باعزاز الحوذۃ و ستر العورۃ (۵۲) یعنی بے شک اللہ اس دین اسلام والوں کے لئے وکیل اور کارساز ہوگیا ہے کہ وہ ان کی جماعت کو غالب کرے گا اور ان کی کمزوریوں کو چھپائے گا''۔ نہج البلاغۃ کے شارح شیعہ عالم ابن میثم بحرانی حضرت علیؓ کے مذکورہ قول کے متعلق فرماتے ہیں وھذا الحکم من قولہ تعالیٰ وعد اللہ الذین اٰمنوا منکم وعملوا الصالحات الایۃ'' (۵۳) ''حضرت علیؓ نے یہ مضمون اللہ تعالیٰ کے قول وعداللہ الذین الخ یعنی آیت استخلاف سے لیا ہے'' چونکہ آیت استخلاف میں بشارت اور وعدہ نزولِ آیت کے وقت کے مومنین کاملین اور صالح و پرہیز گار لوگوں سے کیا گیا تھا جس کا مصداق خلفائے راشدینؓ بدرجۂ اولیٰ ثابت ہوئے تو اس سے ان کی خلافت کی حقانیت اور ان کا ایمان اور اعمال صالحہ کی نعمت سے علیٰ وجہ الکمال بہرہ مند ہونا بھی ثابت ہوا۔ اور ان غیبی خبروں کے ٹھیک ٹھیک پورا ہونے سے قرآن کریم کا معجزہ ہونا بھی واضح ہوا، پس خلفائے راشدینؓ کی طرف جن عیوب اور مطاعن کی نسبت کی جاتی ہے وہ ازخود کالعدم ہوگئے کہ ان خلفائے راشدینؓ کے ایمان اور اعمال صالحہ کی شہادت خود اللہ تعالیٰ نے دی ہے۔ بلکہ نزول آیت کے وقت کے سب صحابہ کرامؓ کے متعلق شہادت دی ہے۔

(و) بحوالہ آیاتِ غنائم بہ سلسلہ غزوۂ حدیبیہ:-

غزوۂ حدیبیہ میں جو مہاجرین وانصار صحابہ کرامؓ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی رضامندی کی بشارت دی کیونکہ انہوں نے (ببول کے) درخت کے نیچے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کی تھی کہ جب تک ہم خونِ عثمانؓ کا قریش مکہ سے قصاص نہیں لے لیتے، یہاں سے نہیں جائیں گے۔ قریش مکہ کے ہاتھوں حضرت عثمانؓ کی شہادت کی جھوٹی افواہ پھیل گئی تھی جس کے نتیجے میں یہ بیعت ہوئی اس بیعت کو بیعت رضوان کہا جاتا ہے۔ اس کا ذکر سورۂ فتح میں ہے۔ بیعت رضوان پر اللہ تعالیٰ نے اپنی رضامندی کا شدّ ومدّ سے اظہار فرمایا اور ساتھ ہی پے در پے ان نعمتوں کی بشارتیں دے ڈالیں جو اہل حدیبیہ کو مستقبل قریب وبعید میں حاصل ہونے والی تھیں چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ وَّ مَغَانِمَ كَثِيْرَةً يَّاْخُذُوْنَهَا وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا o وَعَدَكُمُ اللّٰهُ مَغَانِمَ كَثِيْرَةً تَاْخُذُوْنَهَا فَعَجَّلَ لَكُمْ هٰذِهٖ وَكَفَّ اَيْدِيَ النَّاسِ عَنْكُمْ وَلِتَكُوْنَ اٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ وَيَهْدِيَكُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًاo وَّاُخْرٰى لَمْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهَا قَدْ اَحَاطَ اللّٰهُ بِهَا وَكَانَ اللّٰهُ

عَلیٰ کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرًا○ وَلَوْ قَاتَلَکُمُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَوَلَّوُا الْاَدْبَارَ ثُمَّ لَا یَجِدُوْنَ وَلِیًّا وَّ لَا نَصِیْرًا○ سُنَّۃَ اللّٰہِ الَّتِیْ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّۃِ اللّٰہِ تَبْدِیْلًا (۵۴)" یعنی (مستقبل قریب میں حاصل ہونے والی غزوۂ خیبر کی فتح) کے علاوہ یہ (اصحابِ حدیبیہ) اور بھی بہت سی غنیمتیں حاصل کریں گے اور اللہ زبردست ہے، حکمت والا ہے۔ اللہ نے تم سے بہت سی غنیمتوں کا وعدہ کرلیا ہے جو تم حاصل کرو گے اور یہ غنیمت (یعنی صلح نامہ حدیبیہ کی برکات اور غزوہ خیبر میں فتح وغنیمت) تمہیں بہت جلد دے دی اور لوگوں (شکفار مکہ) کے ہاتھوں کو تم سے روک دیا تاکہ یہ صورت حال تمہارے لئے (اللہ کی قدرت کی) نشانی بنے اور تاکہ وہ تمہیں سیدھی راہ پر چلائے رکھے۔ ان کے علاوہ اور غنیمتیں (بھی تم کو ملیں گی) جن تک ابھی تمہاری رسائی نہیں ہے اللہ نے ان غنائم کا احاطہ کر رکھا ہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اور اگر تم سے کافر جنگ لڑیں تو وہ پیٹھ پھیر جائیں گے پھر وہ اپنے لئے نہ کوئی حمایتی پائیں گے اور نہ مدد گار۔ یہ اللہ کا طریقہ ہے جو پہلے بھی گزر چکا (کہ وہ کفار کو مغلوب اور مومنین کاملین کو بالآخر غالب کیا کرتا ہے) اور تو اللہ کے اس طریقے میں ہرگز کوئی تبدیلی نہیں پائے گا"۔

صلح نامہ حدیبیہ ۶ ہجری میں ہوا۔ غزوہ خیبر ۷ ہجری میں، غزوہ فتح مکہ رمضان ۸ ہجری میں، غزوہ حنین شوال ۸ ہجری میں، اور غزوۂ تبوک ۹ ہجری میں ہوا۔ ۱۰ ہجری میں حجۃ الوداع ہوا اور ربیع الاول ۱۱ ہجری میں رسول اکرم ﷺ رحلت فرما گئے۔ غزوہ خیبر کی غنیمت کا ذکر تو اللہ تعالیٰ نے وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِیْبًا (اور بدلے میں ان اصحاب حدیبیہ کو مستقبل قریب کی فتح دی) اور عَجَّلَ لَکُمْ هٰذِهٖ" کے کلمات سے فرمادیا۔ غزوہ فتح مکہ میں قریش مکہ نے اسلام قبول کرلیا۔ غنیمت حاصل کرنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہ ہوا۔ غزوہ حنین وہوازن میں بے شک بہت سا مالِ غنیمت حاصل ہوا لیکن یہ سارے کا سارا نومسلم مؤلفۃ القلوب (قریش مکہ وغیرہ) کو دے دیا گیا۔ زیر بحث آیات کے مخاطبین اہلِ حدیبیہ یعنی مہاجرین وانصار کو ان اموال غنیمت سے کچھ بھی نہیں دیا گیا تھا غزوۂ تبوک میں دشمن مقابلے پر نہیں آیا اور نہ ہی جنگ ہوئی دیگر سرایا وغیرہ سے کچھ حاصل ہوا ہو تو یہ قابل ذکر غنیمتیں نہیں تھیں۔ حالانکہ زیر بحث آیات غنائم میں پہلے بصیغۂ غائب اور بعد میں بصیغۂ خطاب اہل حدیبیہ کو غنائم کی بشارتیں دی گئیں۔ تیسری مرتبہ پھر بشارت دی گئی کہ اور غنیمتیں بھی تمہیں ملنے والی ہیں جن پر تم ابھی قادر نہیں ہوئے لیکن اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ کوئی شخص معمولی سا بھی غور کرے تو اسے صاف صاف پتہ چلے گا کہ آیات میں ان غیر معمولی نعمتوں کی جانب واضح اشارات ہیں جو خلفائے راشدین کے دور میں صحابہ کرامؓ کو روم وایران کے خلاف معرکوں میں

حاصل ہوئیں اور مسلمان اس قدر متمول ہو گئے کہ کوئی زکوٰۃ لینے والا نہیں ملتا تھا۔ ان آیات سے خلفائے راشدینؓ کی خلافت کا حق ہونا روز روشن کی طرح واضح ہوا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ اہل حدیبیہ کو اللہ تعالیٰ سیدھی راہ پر چلائے رکھنا چاہتا ہے (وَيَهْدِيَكُمْ صِرَاطاً مُّسْتَقِيماً) پس وہ ہرگز مرتد اور گمراہ نہیں ہوئے۔ آخر میں کہا گیا ہے کہ اگر ان اصحابِ رسول ﷺ سے کفار جنگ لڑیں تو بالآخر وہ مغلوب ہوں گے اور اللہ کا یہ قانون وہ قانون ہے جو پہلے سے چلا آرہا ہے کہ کسی بھی پیغمبر کے ساتھیوں پر کفار کو غلبہ حاصل نہیں ہوا بلکہ بالآخر کفار ہی مغلوب ہو کر یا مسلمان ہوئے یا عذاب الٰہی کی گرفت میں آکر نیست و نابود یا ذلیل وخوار ہوئے۔ اصحابِ محمد ﷺ کے معاملے میں اللہ کا یہی قانون چلے گا۔ اکثر مفسرین نے اس آخری آیت کا یہ مفہوم لیا ہے کہ اگر صلح نامہ حدیبیہ نہ ہوتا اور قریش مکہ سے جنگ ہوتی تو وہ شکست خوردہ ہو کر پیٹھ پھیر جاتے لیکن اعتبار خاص شان نزول کا نہیں ہوتا لہٰذا یہاں آیت کے مفہوم کو عام رکھا جائے گا کہ اصحاب محمد ﷺ کی جنگ جن کفار سے بھی ہوگی وہ بالآخر مغلوب ہوں گے، چنانچہ قرآن کریم کی یہ غیبی خبر مستقبل میں بالکل صحیح ثابت ہوئی۔ جزائر عرب اور قیصر وکسریٰ کے وسیع وعریض علاقوں پر خلفائے راشدینؓ کے عہد میں اصحابِ رسول اللہ کو مکمل غلبہ اور تسلط حاصل ہوا اور دین اسلام ان کے ذریعہ مستحکم ہوا۔

(ز) خلفائے راشدینؓ میں یگانگت کا ثبوت تشقیق جدلی کی روشنی میں:

(۱) خلیفہ، حاکم یا امام (جو کچھ بھی کہہ لیں) اگر خود لوگوں پر مسلّط نہ ہوا ہو تو یا وہ ارباب حل و عقد یعنی اس طرح کے معاملات کی سوجھ بوجھ رکھنے اور صحیح مشورے دینے کے اہل لوگوں کی رائے اور مشورے سے منتخب ہوگا یا اللہ تعالیٰ اسے نامزد کرے گا یعنی یا وہ لوگوں کے ذریعے منتخب (Electee) ہوگا۔ یا وہ منصوص من اللہ یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے معین ومتعین اور نامزد (Nominee) ہوگا اگر دوسری شق اختیار کی جائے تو شریعتِ محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام تو قیامت تک کے لئے نافذ ہے لہٰذا سوال پیدا ہوگا کہ دورِ حاضر میں منصوص من اللہ حاکم کون ہے، تاکہ سب متفقہ طور پر اس کی رہنمائی کو قبول کرلیں اور قیل وقال کے تمام دروازے بند ہو جائیں، اگر ایسا کوئی حاکم موجود ہے تو اس کی نشاندہی ہونی چاہئے اور اس کا منصوص من اللہ ہونا بھی قطعیت سے ثابت ہونا چاہئے، اگر ایسا کوئی امام یا حاکم غائب ہے تو اس کی غیبت (غائب ہونے کے زمانے) میں جو لوگ بھی امور مملکت سنبھالیں گے تو وہ معصوم

ہونگے یا غیر معصوم ہوں گے۔ اگر معصوم ہوں گے تو معصومین کی تعداد محدود نہیں رہے گی اور اگر غیر معصوم ہونگے تو مزید سوال پیدا ہوگا کہ امام یا حاکم اعلیٰ کو معصوم ہونا چاہئے یا غیر معصوم؟ اگر معصوم ہونا چاہئے تو ان غیر معصوم حکمرانوں کی حکومت کا جواز کسی بھی صورت میں پیش نہیں کیا جا سکتا، جبکہ ہمارے کچھ بھائی یہ دعویٰ بھی کریں کہ اللہ تعالیٰ پر عدل واجب ہے۔ تو (معاذ اللہ) اللہ تعالیٰ پر الزام آئے گا کہ اس نے حاکم اعلیٰ کے منصوص من اللہ ہونے اور معصوم عن الخطا ہونے کا اصول تو ہمیں دیا لیکن اس کی برکات سے ہمیں نا حق محروم کر دیا۔ رسول اکرم ﷺ کے مخاطب عرب تھے، قرآن ان کی مادری زبان عربی میں نازل ہوا۔ اس وقت تو امام ظاہر ہو، بعد کے لوگوں کے لئے غائب ہو جائے جبکہ بظاہر انہیں اس کی شدید ضرورت ہو۔ یہ کیسا عدل ہے؟ ہاں اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ معصوم عن الخطا ہونا انبیا علیہم السلام ہی کی خصوصیت ہے، ان کے بعد کسی حاکم اعلیٰ کا معصوم ہونا نہ ضروری ہے اور نہ ہی ثابت ہے تو مذکورہ بالا اشکال پیدا نہیں ہوگا۔ پس خلفائے راشدینؓ میں سے کوئی بھی معصوم عن الخطاء نہ تھا کہ معصوم اور غیر معصوم کی بحث چھیڑ کر ان میں تفریق کی جائے کسی کو خلافت کا مستحق اور کسی کو (معاذ اللہ) غیر مستحق قرار دیا جائے۔ سب خلفائے راشدینؓ برحق تھے اور باہم شیر وشکر تھے۔

(۲) اگر امام یا حاکم اعلیٰ منصوص من اللہ بھی ہو، معصوم عن الخطاء بھی ہو، مفترض الطاعۃ بھی ہو یعنی ہر حال میں اس کی اطاعت فرض ہو، سب سے بڑھ کر اگر وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ماسوا دیگر انبیائے کرام علیہم السلام سے افضل بھی ہو تو صاف ظاہر ہے کہ ایسے ائمۃ کا مرتبہ انبیاء سے بھی بڑھ کر ہوگا۔ اگر کوئی شخص کسی نبی کا احترام تو بہت کرتا ہو لیکن اس کی نبوت کا منکر ہو مثلاً کوئی شخص یہ کہے کہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نہایت عالم و متقی، پرہیزگار اور تہجد گزار جانتا ہوں لیکن انہیں اس معنی میں اللہ کا رسول نہیں مانتا کہ اللہ نے انہیں رسالت کے لئے نامزد فرمایا تھا اور یہ کہ ان پر وحی نازل ہوتی تھی یعنی وہ منصوص من اللہ نہیں تھے تو قرآن کریم نے ایسے لوگوں کو پکے کافر قرار دیا ہے چنانچہ سورۂ نساء میں ہے کہ جو لوگ یہ کہیں کہ ہم بعض پیغمبروں کو مانتے ہیں اور بعض کو نہیں مانتے اس طرح وہ چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے پیغمبروں کے درمیان تفریق کریں تو یہ لوگ پکے کافر ہیں۔ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْکٰفِرُوْنَ حَقًّا (۵۵)

اب دیکھئے کہ امت مسلمہ کی عظیم اکثریت حضرات ائمہ کرام رضوان اللہ علیہم کا نہایت احترام تو کرتی ہے لیکن وہ حضرات انبیا علیہم السلام کے بعد کسی کو بھی منصوص من اللہ، مفترض الطاعہ اور معصوم عن الخطا نہیں سمجھتی۔ جہاں تک فضیلت کا تعلق ہے تو کسی کا پیغمبروں سے افضل ہونا تو درکنار مسلمانوں کی اس

عظیم اکثریت کا یہ عقیدہ ہے کہ امام ابوحنیفہ، امام شافعیؒ، امام جعفر صادقؒ وغیرہ میں سے کوئی بھی کسی بھی صحابی رسول کا ہرگز ہم مرتبہ نہیں ہے۔ اب لازماً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی یہ عظیم اکثریت مخصوص عقیدۂ امامت کا انکار کر کے بھی مسلمان رہے گی یا نہیں؟ اگر انہیں مسلمان کہا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ کسی اسلامی عقیدے کا کوئی اقرار کرے یا صاف انکار کرے، دونوں صورتوں میں وہ مسلمان ہی رہے گا تو ایسے عقائد کی (معاذ اللہ) اہمیت ہی کیا رہی؟ اگر دوسری شق اختیار کی جائے کہ مخصوص عقیدۂ امامت کا انکار کرنے والے تمام مسلمان (معاذ اللہ) دائرۂ اسلام سے خارج ہوگئے تو اتحاد بین المسلمین کے دعووں اور نعروں میں سرے سے جان ہی باقی نہ رہی۔ اگر یہاں مومن و مسلم کی تفریق کی جائے کہ عقیدہ امامت کا اقرار کرنے والا تو مومن بھی ہے اور مسلم بھی، لیکن اس کا انکار کرنے والا مومن نہیں صرف مسلم ہے تو مزید سوال یہ پیدا ہوگا کہ ایسا مسلم عقیدۂ امامت کا انکار کر کے جنت میں جائے گا یا جہنم میں جائیگا؟ یا وہ اس عقیدے کے انکار کی سزا بھگت کر جنت میں جائیگا؟ اگر وہ جنت میں جائے گا تو عقیدہ امامت کی اہمیت پر پھر سوالیہ نشان لگ گیا۔ اگر جہنم میں جائے گا تو سوچئے کہ اتحاد بین المسلمین کے دعووں اور نعروں میں جاذبیت اور کشش کیسے پیدا ہوگی؟ اگر تیسری شق اختیار کی جائے تو دیگر عقائد مثلاً توحید، رسالت اور آخرت کے انکار کا بھی یہی حشر ہونا چاہئے کہ انکار کرنے والے کچھ عرصے کے لئے سزا بھگت کر ہمیشہ کے لئے جنت میں چلے جائیں۔ یا جنت میں ان کے درجات نسبۃً کم ہوں، عقیدۂ امامت ان عقائد سے کیوں کر مستثنیٰ ہے؟ لہٰذا اتحاد بین المسلمین کی دعوت کے جذبۂ صادقہ کو عقلی و دینی بنیادیں فراہم کرنے کے لئے غلو اور مبالغے سے پرہیز کرنا ہوگا جس طرح کسی نبی کو خدا سے بڑھا دینا غلو ہے اسی طرح کسی امام کو نبی سے بڑھا دینا بھی غلو ہے ورنہ اتحاد بین المسلمین کی دعوت محض جذباتی بنیادوں پر استوار ہوگی گو یہ بھی غنیمت ہے بشرطیکہ ہم اختلافِ رائے کے باوجود ایک دوسرے کا احترام کریں اور اپنے موقف کو پیشہ ورانہ مناظرانہ اور جارحانہ انداز کی بجائے سنجیدہ دلائل سے پیش کریں اور اختلافِ رائے کو جنگ و جدال کی صورت نہ دیں تاکہ ملک وقوم کے دشمنوں کے خلاف ہم سب کا محاذ مشترک ہو۔ الغرض مخصوص عقیدۂ امامت کی آڑ میں خلفائے راشدین میں تفریق کی کوئی گنجائش نہیں۔

(۳) اگر حضرت ابوبکر صدیقؓ کے دور خلافت میں قرآن کریم کی جمع و تدوین کو تسلیم نہ بھی کیا جائے تو اس سے تو کسی کا بھی انکار نہیں ہوسکتا کہ حضرت عثمانؓ نے اپنے دور خلافت میں لغتِ قریش والے نسخے کا لوگوں کو پابند کیا اور اس کی نقول کروا کر اطراف میں بھجوائیں اور باقی تمام نسخے ضائع

کرائے۔ اگر حضرت عثمانؓ (معاذ اللہ) خلیفۂ برحق نہیں تھے اور ظالم وغاصب تھے تو قرآن کریم سے اعتماد اٹھ جائے گا۔ ممکن ہے کہ آپ نے اس قرآن میں (معاذ اللہ) تحریف کر ڈالی ہو اور آیت۔ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّالَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (ہم نے ہی اس نصیحت یعنی قرآن کو اتارا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں)'' بھی (معاذ اللہ) لوگوں کو دھوکہ دینے کے لئے اپنی طرف سے ڈال دی ہو، اگر یہ کہا جائے کہ سیدنا حضرت علیؓ نے اس مصحفِ عثمانی کے صحیح ہونے کی تصدیق فرمادی تھی تو حضرت عثمانؓ کو (معاذ اللہ) ناقابل اعتماد ٹھہرانے کی صورت میں یہ دعویٰ کچھ ایسا ہی ہے کہ کوئی شخص یہ کہے کہ تورات کی جمع وتدوین یا اس کی حفاظت اور نشر واشاعت فرعون کے سپرد تھی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام یا ان کے مخلص ساتھیوں نے اس جمع وتدوین، حفاظت اور نشر واشاعت کے صحیح اور برحق ہونے کی تصدیق کردی تھی۔ یا مثلاً انجیل کو ان یہودیوں نے جمع کیا تھا یا اس کی نشر واشاعت کی تھی جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مبینہ طور پر مصلوب کرانے میں پیش پیش تھے لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام یا ان کے مخلص حواریوں نے اس کی تصدیق وتوثیق کردی تھی۔ ظاہر ہے کوئی عقل مند ایسے مفروضوں کو تسلیم نہیں کرے گا۔ نیز جب سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ بالاتفاق اسد اللہ الغالب ہیں تو بجائے اس کے کہ قرآن کریم کی جمع وتدوین اور اس کی نشر واشاعت (معاذ اللہ) ناقابل اعتماد لوگ کرتے خود آپ کو ہی فریضہ پورا کرنا چاہئے تھا۔ اگر (معاذ اللہ) آپ کے مجبور ومغلوب ہونے کا عذر کیا جائے تو یہ اس لئے غلط ہے کہ آپ بالاتفاق اسد اللہ الغالب ہیں دوسرے اس صورت میں اللہ تعالیٰ پر الزام آئے گا کہ ایسے ائمہ بھیجے جو قرآن کریم کی جمع وتدوین اور نشر واشاعت تک سے قاصر تھے اور یہ کام (معاذ اللہ) ناقابل اعتماد بلکہ (معاذ اللہ) منافقین سے لیا گیا یا فساق وفجار کو یہ خدمت سرانجام دینا پڑی۔ یہ ٹھیک ہے کہ اللہ کبھی کسی فاسق سے بھی دین کو مدد پہنچاتا ہے لیکن اس طرح تو مدد نہیں پہنچاتا کہ اس کا دین ہی سرے سے مشکوک ہو کر رہ جائے۔ نیز اس مفروضے کی صورت میں کہ سیدنا حضرت علیؓ (معاذ اللہ) مجبور ومغلوب تھے آپ کے لئے شرعاً اس کی بھی گنجائش اور رخصت ہوگی کہ (نام نہاد) مخالفین سے اپنی جان، مال اور عزت کی حفاظت کے لئے آپ خلافِ حقیقت بات کہیں خواہ ایسا کرنے کو تقیہ، کتمان یا کوئی بھی اصطلاحی نام دے دیا جائے۔ بلکہ گنجائش تو درکنار اگر یوں خلاف حقیقت بات کہنے یعنی تقیہ سے کام لینے کو واجب بھی ٹھہرایا جائے تو سوچئے کہ اس طرح کے مفروضہ حالات میں سیدنا حضرت علیؓ کی تصدیق اور توثیق کا بھی کیا اعتبار رہا؟ اُس دور کے لوگوں کی عظیم اکثریت تو (معاذ اللہ) اس لئے ناقابل اعتماد ٹھہری کہ انہوں نے نام نہاد ظالم حکمرانوں کا کھلم کھلا ساتھ دیا اور سیدنا حضرت

علیؓ کے مٹھی بھر ساتھی کتمان وتقیہ یعنی حقائق کے اخفا اور خلافِ حقیقت بات کہنے کے (معاذ اللہ) شرعاً پابند ہوں تو (معاذ اللہ) سب کے سب ناقابل اعتماد ہوگئے جب قرآن کریم انہی حضرات سے آئندہ نسلوں تک منتقل ہوا تو (معاذ اللہ) یہ بھی ناقابل اعتماد ہوا۔ فرق صرف یہ ہے کہ مفروضہ صورت حال میں نام نہاد ظالم خلفا تو (معاذ اللہ) سخت گناہ گار ٹھہرے البتہ سیدنا حضرت علیؓ اور ان کے ساتھیوں کو مبینہ طور پر تقیہ وکتمان کا شرعی فریضہ پورا کرنے پر ثواب ملا ہوگا لیکن قرآن تو (معاذ اللہ) ناقابل اعتماد ہی رہے گا حالانکہ قرآن کریم بالاتفاق صحیح اور ہر طرح کی تحریف سے پاک ہے پس ثابت ہوا کہ خلفائے راشدینؓ میں کوئی دینی اختلاف تھا ہی نہیں بشمول سیدنا حضرت علیؓ سب نے ہی اپنے اپنے دور میں حتی المقدور قرآن کریم کی خدمت کی ہے۔ دینِ حق اسلام کی تبلیغ وترویج، قرآن کریم کی نشر واشاعت اور کفار کے خلاف قتال فی سبیل اللہ میں سب باہم متفق تھے۔ سب شیر وشکر تھے۔

اگر کہا جائے کہ سیدنا حضرت علیؓ نے اپنے دور خلافت میں موجود قرآن کریم کے صحیح اور غیر محرف ہونے کی تائید وتوثیق کی تھی اور وہ ان ایام میں مجبور ومغلوب نہ تھے بلکہ خود خلیفہ اور حاکم تھے۔ اس صورت میں دو شقیں پیدا ہوتی ہیں یا تو حضرت علیؓ کی خلافت وامارت واقعی مستحکم تھی اور آپ کو اپنی ماتحت رعایا پر مکمل اقتدار اور تسلط حاصل تھا یا غیر مستحکم تھی اور اپنی ماتحت رعایا پر اقتدار اور حکومت کو قائم رکھنے کے لئے آپ کو کتمان وتقیہ سے کام لینا پڑتا تھا۔ اگر پہلی شق اختیار کی جائے تو نہ صرف یہ ثابت ہوا کہ حضرت علیؓ سے پہلے خلفا نے جمع وتدوینِ قرآن میں کسی تحریف اور خیانت سے کام نہیں لیا بلکہ یہ بھی ثابت ہوا کہ ان کے باقی کام مثلاً بیس تراویح کا باجماعت اجراء، متعہ کو حرام قرار دے کر اس پر مکمل پابندی کا نفاذ، اذان واقامت کے مروجہ کلمات، اموال فے اور باغِ فدک کے متعلق ان کی پالیسی اور دستور العمل وغیرہ وغیرہ سب کے سب درست تھے کیونکہ حکومت کے مستحکم ہونے کی صورت میں عقلاً بھی اور قرآن کریم کی سورہ حج میں مذکور آیت تمکین کی رو سے شرعاً بھی نیکی کی ترویج اور برائی کے استیصال کے حضرت علیؓ پابند تھے۔ اگر دوسری شق اختیار کی جائے کہ (معاذ اللہ) آپ کا اقتدار مستحکم نہ تھا اور لوگوں کو قابو میں رکھنے کے لئے آپ تقیہ وکتمان کے پابند تھے تو قرآن کریم کے صحیح اور ہر طرح سے غیر محرف ہونے کے متعلق اشکال باقی رہے گا۔ لہذا پہلی شق ہی صحیح ہے۔

(۴) اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ خلفائے راشدینؓ کے درمیان گرم یا سرد آویزش تھی مثلاً پہلے تینوں خلفا (معاذ اللہ) چوتھے خلیفہ سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف تھے تو وہ سیدنا حضرت علیؓ کے

مقابلے میں یا غالب ہونگے یا مغلوب ہوں گے۔ اگر غالب تھے تو سوچئے کہ سیدنا حضرت علیؓ (جن کی شجاعت میں کوئی کلام نہیں) کو اسد اللہ الغالب یعنی اللہ کا غالب شیر کہنا کیسے درست ہوگا؟ اگر کہا جائے کہ وہ مغلوب تھے مگر سیدنا علیؓ نے غالب ہونے کے باوجود صبر سے کام لیا اور اپنا حق نہیں لیا تو اتحاد بین المسلمین کی خاطر حضرت علیؓ کی اس سنت پر سب کو سختی سے عمل کرنا چاہئے لیکن بات پھر بھی یہاں ختم نہیں ہوتی یہاں عقلاً پانچ شقیں ممکن ہیں۔ مبینہ مخالفین پر غالب ہونے کے باوجود سیدنا حضرت علیؓ نے جو صبر سے کام لیا اس سے مسلمانوں کو یا تو فائدہ پہنچا یا ان کا نقصان ہوا یا نقصان تو ہوا لیکن اگر آپ صبر سے کام نہ لیتے تو زیادہ نقصان ہو جاتا یا نہ کوئی فائدہ ہوا اور نہ ہی نقصان ہوا یا فائدہ تو ہوا لیکن اگر حضرت علیؓ پہلے خلیفہ ہوتے تو فائدہ زیادہ ہوتا۔ اگر کہا جائے کہ آپ کے صبر کرنے سے مسلمانوں کو فائدہ ہوا تو آپ کا خلیفۂ اول ہونا ناگزیر نہ ہوا کیونکہ مسلمانوں کو فائدہ تو پہنچ ہی رہا تھا۔ اگر کہا جائے کہ آپ کے صبر سے مسلمانوں کو نقصان ہوا تو اندریں صورت (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) حضرت علی رضی اللہ عنہ پر الزام آئے گا کہ طاقت رکھنے اور غالب ہونے کے باوجود آپ نے مسلمانوں کے اس نقصان کا ازالہ نہ فرمایا۔ یہ تو ایسا گناہ کبیرہ ہے کہ اس کی سیدنا حضرت علیؓ کی طرف نسبت کرنا بہت بڑی جسارت بلکہ بجائے خود گناہ کبیرہ ہے۔ اگر کہا جائے کہ آپ کے صبر سے مسلمانوں کا نقصان تو ہوا لیکن آپ صبر نہ کرتے تو ان کا زیادہ نقصان ہو جاتا تو یہاں مزید سوال پیدا ہوگا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا حضرت علیؓ یا کسی کے لئے بھی خلیفۂ اول بلکہ خلیفہ بلافصل کی صاف صاف اطلاع فرمادی تھی یا نہیں؟ اگر فرمادی تھی تو جن لوگوں نے کھلم کھلا حضرت ابوبکر صدیقؓ کا ساتھ دیا تو انہوں نے فرمانِ رسول کا یا تو صاف انکار کر دیا ہوگا یا اقرار کے باوجود صاف صاف نافرمانی کی ہوگی پہلی صورت میں وہ (معاذ اللہ) کافر ہو گئے، مسلمان ہی کب رہے دوسری صورت میں وہ معاذ اللہ پرلے درجے کے فاسق وفاجر ہوئے۔ دونوں صورتوں میں حضرت علیؓ بھلا کونسے مسلمانوں کو بڑے نقصان سے بچانا چاہتے تھے؟ اگر حضرت علیؓ اسد اللہ الغالب ہونے کی بنا پر اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ ہی جہاد فرماتے تو زیادہ سے زیادہ یہی ہوسکتا تھا کہ یہ چند ساتھی مرتبہ شہادت پر فائز ہو جاتے لیکن حضرت علیؓ ان نام نہاد کفار اور فساق وفجار پر غالب آ کر ان کو از سر نو دعوتِ دین دیتے اور فریضۂ امامت کی ذمہ داریوں سے علیٰ رؤوس الاشہاد عہدہ برآ ہوتے، اگر کہا جائے کہ آپ غیب دان (عالم ماکان ویکون) تھے۔ آپ کو پتہ تھا کہ مٹھی بھر ساتھی شہید بھی ہو جائیں اور لوگوں پر غلبہ بھی ہو جائے تو بھی یہ لوگ راہ راست پر نہیں آئیں گے اس لئے آپ خاموش رہے تو جواب یہ ہے کہ جب اسی علم غیب کی بنا پر انہیں

معلوم تھا کہ امیر معاویہؓ سے وہ بالآخر صلح کرلیں گے اور ان کے صاحبزادے سیدنا حضرت حسنؓ تو باقاعدہ صلح کر کے حکومت سے ہی دستبردار ہو جائیں گے تو جنگ صفین کا کیا مقصد ہوا جس میں بہت کشت وخون بھی ہوا۔ جب علم غیب کی بنا پر آپ کو پتہ تھا کہ مبینہ طور پر مجہول النسب زیاد بالآخر امیر معاویہؓ سے جا ملے گا اور اس کا خبیث ترین بیٹا عبیداللہ بن زیاد سانحۂ کربلا کے اہم ذمہ داروں میں سے ہوگا تو آپ نے ایسے شخص کو سالہا سال عامل (گورنر) کے عہدے پر کیوں فائز رکھا اور کیوں اس کی عزت افزائی فرمائی؟ اگر آپ غیب دان نہیں تھے اور قرآن کریم کا دعویٰ بھی یہی ہے۔ قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ (۵۶) ''یعنی (اے پیغمبر!) کہہ دیجئے کہ آسمانوں اور زمین میں اللہ کے سوا کوئی غیب نہیں جانتا'' تو صاف معلوم ہوا کہ یہ مفروضے اور ان پر رکھی جانے والی بنیادیں ہی غلط ہیں۔

اب آیئے دوسری ذیلی شق کی طرف کہ رسول نے حضرت علیؓ کے خلیفۂ اول ہونے کی صاف صاف لفظوں میں اطلاع نہیں دی تھی بلکہ اشارات وکنایات سے کام لیا تھا تو سوچیے کہ اشارات وکنایات سے عقائد کب ثابت ہوتے ہیں، اور جو لوگ ان اشارات وکنایات کو سمجھ نہ سکیں ان کا قصور کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے باقی عقائد توحید، رسالت، آخرت وغیرہ بھی اشارات وکنایات میں کیوں نہ بیان فرمائے؟ پھر اگر عقیدہ امامت کے اشارات وکنایات کو اس زمانے کے لوگ سمجھ نہ پائے تو بعد والے انہیں کیسے سمجھ گئے؟ اگر وہ سمجھ پائے تھے تو بات پھر وہیں آ کر رک گئی کہ آخر حضرت علیؓ نے غالب ہونے کے باوجود ایسے لوگوں کی کیوں رعایت فرمائی؟ پس یہ شق باطل ثابت ہوئی کہ سیدنا حضرت علیؓ کے صبر سے گو نقصان تو مسلمانوں کا ہوا لیکن صبر نہ کرتے تو زیادہ نقصان ہو جاتا۔ چوتھی شق کہ حضرت علیؓ کے (باوجود غالب ہونے کے) صبر کرنے اور خلیفہ اول باختیار خود نہ بننے سے مسلمانوں کا نہ تو فائدہ ہوا اور نہ ہی نقصان ہوا اور پانچویں شق کہ فائدہ تو ہوا لیکن حضرت علیؓ پہلے خلیفہ ہوتے تو زیادہ فائدہ ہوتا تو غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ یہ بھی دراصل نقصان ہی کی صورتیں ہیں اور سطور بالا میں مذکور ابتدائی پانچ شقوں میں سے دوسری شق میں ہی شامل ہیں کہ (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) حضرت علیؓ نے غالب ہونے کے باوجود خلیفہ اول نہ بن کر اور نام نہاد ظالم اور غاصب خلفا کو نہ ہٹا کر بلکہ ان سے مکمل تعاون فرما کر مسلمانوں کا نقصان کر دیا کوئی عقل مند مسلمان سیدنا حضرت علیؓ پر ایسے الزام کی جسارت نہیں کرے گا۔ نیز یہ بھی سوچئے کہ جب حضرت علیؓ غالب تھے تو خلفائے ثلاثہ یا کوئی اور شخص یا گروہ حضرت علیؓ اور ان کے اعزہ واقارب کو ان کے کسی حق سے محروم کیسے کر سکتا تھا؟ اندریں صورت ان خلفا کو غاصب وظالم کہنا کیسے درست ہوگا؟

اگر سیدنا حضرت علیؓ کو اسد اللہ الغالب بھی کہا جائے اور ساتھ ہی یہ بھی کہا جائے کہ وہ بذاتِ خود بہادر تھے لیکن (نام نہاد) مخالفین کے مقابلے میں لوگوں نے ان کا ساتھ نہیں دیا اس لئے وہ مجبور تھے تو اس صورت میں بھی اسد اللہ الغالب'' کے الفاظ وکلمات میں لفظ'' غالب'' پر غور کیا جائے اگر شیر مغلوب ہو جائے تو وہ پھر بھی شیر ہی رہے گا اس کی شجاعت بھی مسلم رہے گی لیکن اسے غالب نہیں کہا جا سکتا۔ بلا شبہ بعض اوقات اہل حق کو مخالفین سے تکالیف پہنچتی ہیں کبھی وہ ان کے ہاتھوں مجبور بلکہ شہید بھی ہو جاتے ہیں مثلاً حضرت زکریا علیہ السلام اور ان کے صاحبزادے حضرت یحییٰ علیہ السلام کو شہید کیا گیا لیکن ان میں سے کسی کو بھی'' اسد اللہ الغالب'' کا لقب نہیں دیا گیا تھا۔

مذکورہ بالا بحث سے یہ صاف طور پر واضح ہوا کہ سیدنا حضرت علیؓ بلا شبہ اسد اللہ الغالب ہیں۔ ہمارا ایمان ہے کہ نہ ان پر کوئی غالب آ سکتا ہے اور نہ ہی وہ مجبور و بے بس ہو سکتے ہیں۔ بعض تاریخی روایات میں یہ جو آتا ہے کہ حضرت علیؓ نے حضرت عثمانؓ کی شہادت پر فرمایا تھا کہ میں نہ اس پر راضی تھا نہ ہی میں نے اس کا حکم دیا تھا بلکہ میں مغلوب ہو گیا، تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ سیدنا حضرت علیؓ نے حضرت عثمانؓ کے قصر خلافت کا محاصرہ کرنے والوں کے خلاف کوئی باقاعدہ جنگ لڑی تھی اور وہ (معاذ اللہ) مغلوب ہو گئے تھے بلکہ وجہ یہ تھی کہ خود حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے سب کو سختی سے منع کر رکھا تھا کہ محاصرین اور ان کے ساتھیوں کے خلاف جنگ کی ابتداء ہرگز ہرگز نہ کی جائے۔ جہاں تک جنگ صفین کا تعلق ہے تو ہمارے نزدیک بظاہر متضاد عمل کے باوجود فریقین میں سے کوئی بھی باطل پر نہ تھا بعینہ جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام دونوں میں سے کوئی بھی باطل پر نہ تھا حالانکہ بنی اسرائیل کی گوسالہ پرستی کے سلسلے میں دونوں میں اختلافِ رائے ہوا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت ہارونؑ سے سخت کلامی بھی کی تھی ہم اس مضمون کو مناسب مقام پر قدرے تفصیل سے بیان کریں گے تو چونکہ حق کا حق سے کوئی حقیقی تعارض ہوتا ہی نہیں، اگر ہوگا بھی تو محض ظاہری اور صوری ہوگا، حقیقی نہ ہوگا اس لئے یہاں کسی کے غالب یا مغلوب ہونے کی بحث ہی پیدا نہیں ہوتی۔ حضرت علی اسد اللہ الغالب ہیں ان کا دیگر خلفائے راشدینؓ سے ہرگز کوئی دینی اختلاف تھا ہی نہیں۔ معمولی فروعی اختلاف یا تدبیر و انتظام کا اختلاف دراصل حقیقی اختلاف ہے ہی نہیں کیونکہ ایسا اختلاف اصولوں میں نہیں ہوتا۔ الغرض سب خلفائے راشدینؓ باہم متفق اور شیر وشکر تھے ورنہ مذکورہ بالا قسم کے لاتعداد اور لاینحل اشکالات میں مغز کھپائی کے باوجود راہ نہیں ملے گی۔ یہ خلفائے راشدینؓ کی کرامت ہے کہ کوئی ان میں تفریق کرنے میں

ہرگز کامیاب نہ ہوگا۔ اس قسم کی باتیں بے معنی ہیں کہ صحابہ (معاذ اللہ) تھے تو منافق لیکن ان کی اذان اور ان کا نماز روزہ حضرت علیؓ کو بہت پسند تھا اور یہ کہ انہیں خدشہ تھا کہ ان کے خلاف جہاد کیا تو کہیں یہ اذان کے پیارے کلمات ہی بند نہ ہو جائیں۔ منافق کی کوئی نیکی عنداللہ مقبول ہی نہیں تو ایسی نام نہاد نیکیوں کی رعایت بھلا سیدنا حضرت علیؓ کیوں فرماتے؟ اگر ان مبینہ منافقین کی اذانیں بالفرض بند بھی ہو جاتیں تو کیا حضرت علیؓ اور ان کے ساتھیوں کو اذان کے کلمات معلوم نہ تھے؟ الغرض حضرت علیؓ اور ان کے اعزہ و اقارب ہرگز دوسرے صحابہ کرامؓ سے کوئی الگ تھلگ جماعت علانیہ یا خفیہ بنا کر دیگر خلفائے راشدینؓ کے خلاف کسی سرد جنگ (cold war) میں مشغول نہ تھے۔

(۵) قرآن کریم میں کفر کے مغلوب ہونے اور اسلام کے غالب آنے کی بشارات بارہا دی گئی ہیں مثلاً سورۂ فتح کے تیسرے رکوع کو پڑھ جایئے وہاں اصحاب رسول کو مخاطب کر کے بے شمار فتوح اور غنائم کی بشارتیں دی گئی ہیں ساتھ ہی چوتھے رکوع میں دین اسلام کے دیگر ادیان باطلہ پر کامل غلبہ کی بشارت موجود ہے یہاں اسلام کا عسکری و سیاسی غلبہ مراد ہے ورنہ صرف دلائل کی بنا پر تو حق ہمیشہ غالب رہتا ہے کبھی مغلوب ہوتا ہی نہیں۔ پھر دلائل کی بنا پر حق و باطل میں امتیاز کرنا اور لوگوں پر اسے کما حقہ واضح کرنا اور دین حق کو لوگوں تک بلاکم و کاست ٹھیک ٹھیک پہنچا دینا اور اسلام میں نئے داخل ہونے والوں کی سیاسی اور دینی رہنمائی کرنا تبھی ممکن تھا کہ اس دور کی دو نہایت طاقتور عالمی قوتوں یعنی روم و ایران کی حکومتوں پر کاری ضرب لگائی جاتی جو لوگوں کی شخصی آزادیوں کو سلب کئے ہوئے تھیں۔ رسول اکرم ﷺ کی بعثت صرف عربوں کے لئے ہی نہیں تھی بلکہ ساری دنیا کے لئے آپ کا پیغام ابدی اور آفاقی پیغام ہے اس لئے غلبہ اسلام کی بشارتوں کی تکمیل خلفائے راشدین کے ذریعہ بالخصوص ہوئی اور ان کے ذریعہ اسلام کو شرک و بت پرستی، یہودیت، نصرانیت اور مجوسیت سب پر عسکری و سیاسی غلبہ بھی حاصل ہوا اور عربوں کے بعد عجمی اقوام بھی اسلام سے آشنا اور اس کی برکات سے بہرہ مند ہوئیں۔ اب اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے فوراً بعد (معاذ اللہ) ظالموں کو غلبہ حاصل ہو گیا تھا اور اہل حق مظلوم و مغلوب ہو گئے تھے اور خود اپنی حیات طیبہ میں آپ خواہ کسی کے لئے بھی پروانۂ خلافت لکھوانا چاہتے تھے لیکن کچھ لوگوں نے ایسا نہ کرنے دیا مثلاً اپنی زندگی کے آخری ایام میں حضرت اسامہ بن زید کی مہم روانہ فرمانا چاہتے تھے لیکن کچھ لوگوں نے ایسا نہ کرنے دیا تو کون عقل مند اسلام کو غالب قرار دے گا؟ پس قرآنی بشارات ہی سچی ہیں اور ان کے برعکس باقی سب مفروضے غلط ہیں۔

چند فکری لغزشوں کا علمی تعاقب

(الف) بحوالہ آیت ولایت:

سورہ مائدہ میں ہے۔ اِنَّمَا وَلِیُّکُمُ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوا الَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ وَھُمْ رَاکِعُوْنَ (۵۷) ''بات سوائے اس کے نہیں کہ تمہارا ولی اللہ ہے اور اس کا رسول ہے اور وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے جو نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور رکوع کرنے والے ہیں''۔

مذکورہ بالا آیت کے متعلق ہمارے امامیہ بھائیوں کا دعویٰ ہے کہ یہ آیت (بقول ان کے) باتفاق مفسرین خاصۃً عامۃً (یعنی شیعہ وسنی) حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان میں نازل ہوئی ہے۔ یہاں بقول ان کے ولی کا معنی حاکم ہے اور والذین یقیمون الصلوٰۃ سے حضرت علیؓ مراد ہیں کیونکہ انہوں نے ہی بحالتِ رکوع ایک سائل کو اپنی انگوٹھی صدقہ میں دی تھی لہٰذا وہی خلیفہ بلافصل ہیں۔

تبصرہ

(۱) زیر بحث آیتِ ولایت کے سیاق وسباق سے صاف واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو یہود ونصاریٰ کفار سے دوستی سے منع فرمایا ہے اور یہ بتایا ہے کہ تمہارا دوست اللہ اور اس کا رسول ہے اور وہ اہل ایمان تمہارے دوست ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور رکوع کرتے ہیں۔ یہاں ''وھم راکعون'' میں ''واؤ'' حالیہ نہیں ہے کہ آیت کا ترجمہ یوں کیا جائے ''..... نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اس حال میں کہ وہ رکوع کر رہے ہوں''

سورہ بقرہ میں ہے۔ وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ وَارْکَعُوْا مَعَ الرّٰکِعِیْنَ (۵۸) ''نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو'' دیکھئے اس آیت میں بھی رکوع کا ذکر نماز سے الگ کیا گیا ہے۔ اسی طرح آیتِ ولایت میں بھی رکوع کو نماز سے الگ ذکر کیا ہے تو یہاں دونوں آیات میں ''واؤ'' عاطفہ ہے جو اردو میں ''اور'' کا معنی دیتی ہے۔ اگر آیت ولایت میں ''واؤ'' کو حالیہ قرار دیا جائے تو قاعدے کے مطابق دونوں جملوں کی ضمیر سے حال بنے گا اور ترجمہ یہ ہوگا کہ وہ بحالتِ رکوع نماز ادا کرتے ہیں اور بحالتِ رکوع زکوٰۃ دیتے ہیں۔ یہ ترجمہ مہمل ہوگا نیز آیت میں

سب مومنوں کا ذکر ہے۔ پوری سورۂ مائدہ میں اس آیت سے پہلے یا بعد میں کہیں بھی حضرت علیؑ یا کسی بھی اور صحابی کا ذکر تو کیا اشارہ تک نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کو من حیث الجماعۃ مخاطب کیا گیا ہے تو جمع کے صیغے سے بغیر کسی نہایت قوی اور یقینی قرینے کے فردِ واحد مراد لینا کسی طرح درست نہیں کیونکہ جمع بول کر واحد مراد لینا مجاز ہے اور مجازی معنی بغیر قرینے کے لینا درست نہیں۔ آیت میں ولی کا معنیٰ ''دوست'' ہے جیسا کہ سیاق کلام یعنی اگلی اور پچھلی آیتوں سے بخوبی واضح ہے۔ لفظ ''والی'' بمعنی حاکم آیا کرتا ہے نہ کہ ''ولی''۔ بالفرض اس کا معنی حاکم کا بھی ہو تو بھی سیاق وسباق سے ہرگز اس معنی کی تائید نہیں ہوتی جیسے 'ولی اللہ'' کا معنیٰ ''اللہ کا دوست' ہے نہ کہ اللہ کا حاکم۔ اگر کھینچا تانی سے آیت میں ولی کا معنیٰ ''حاکم'' کیا جائے تو بھی اس کے ساتھ ''بلافصل'' کی قید کیسے لگ سکتی ہے؟۔ نیز آیت میں رکوع کو لغوی مفہوم ''خشوع وخضوع'' میں بھی لیا جاسکتا ہے ضروری نہیں کہ نماز کا اصطلاحی رکوع ہی لیا جائے۔ اگر بحالتِ رکوع زکوٰۃ ادا کرنے کا مفہوم صحیح ہو تو آیت کی رو سے ایسا کرنا بہترین عمل قرار پائے گا اور جس روایت کے سہارے یہ مفہوم لیا جارہا ہے اگر اس روایت کو صحیح سمجھا جائے تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول وفعل سے اس کی توثیق فرمادی لہذا بحالتِ رکوع زکوٰۃ کی ادائیگی ہمیشہ کے لئے مستحسن اور قابلِ تعریف ہونی چاہئے تھی لیکن خود ہمارے امامیہ بھائی اس نیک عمل سے محروم چلے آرہے ہیں پس ثابت ہوا کہ نہ تو روایت صحیح ہے اور نہ ہی قرآنی آیت کا یہ مفہوم صحیح ہے کہ حضرت علیؑ یا کسی نے بھی بحالتِ رکوع زکوٰۃ ادا کی تھی۔ ورنہ امت زکوٰۃ کی ادائیگی کے اس طریقے پر تواتر سے عمل کرتی چلی آتی۔

(۲) بحالتِ رکوع زکوٰۃ ادا کرنا عملِ کثیر ہے جس کی نماز میں گنجائش نہیں اگر کہا جائے کہ ایسا کرنے سے درنیکیاں جمع ہوگئیں تو اس کی بھی گنجائش ہونی چاہئے کہ کوئی شخص نماز پڑھنے کی حالت میں مہمان کی ضیافت کرے۔ قرآن کریم میں ہے کہ وہ مومن کامیاب ہوگئے جو اپنی نماز میں خشوع اختیار کرتے ہیں (۵۹) نیز ارشاد ہے کہ اللہ کے لئے (نماز میں) عاجز ہوکر کھڑے ہوا کرو (۶۰) نماز میں حضرت علیؑ کے خشوع وخضوع کا ذکر امام خمینی نے اپنی کتاب ''توضیح المسائل'' میں یوں کیا ہے'' چنانچہ در حال نماز تیر را از پائے مبارک امیر المومنین علیہ السلام بیروں کشیدند آنحضرت متوجہ نہ شدند (۱/۶۱) ''یعنی لوگوں نے حضرت امیر المومنین (حضرت علیؑ) کے مبارک پاؤں سے تیر کھینچ کر باہر نکالا جب کہ آپ نماز پڑھ رہے تھے لیکن آپ کو توجہ نہ ہوئی''۔ نیز اسی کتاب میں ارشاد فرماتے ہیں،'' ودر حال نماز بیاد خدا خضوع وخشوع ووقار باشد ومتوجہ باشد کہ باچہ کسی سخن میگوید وخود را در مقابل عظمت وبزرگی خداوند عالم

بسیار پست وناچیز بیندواگرانسان درموقع نماز کاملاًبایں مطلب توجہ کنداز خود بے خبر میشود'' (۲/۶۱) ''نماز کی حالت میں انسان خشوع، خضوع اور وقار اختیار کرے اور یہ سوچے کہ میں کس سے گفتگو کر رہا ہوں۔ اپنے آپ کو انتہائی پست اور ناچیز جانے۔ اگر انسان نماز کی حالت میں پوری طرح اس تصور کو قائم رکھے تو وہ اپنے آپ سے بے خبر ہو جاتا ہے''۔ ان سطور کے بعد امام خمینی نے حضرت علیؑ کے نماز میں خشوع و خضوع کی مذکورہ مثال پیش فرمائی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کوئی بھیک مانگنے والا سائل اپنی صدا سے حضرت علیؑ کی نماز میں خلل نہیں ڈال سکتا تھا اور نہ ہی ان کی توجہ اپنی طرف مبذول کرا سکتا تھا۔ لہذا روایت جھوٹی ہے بالفرض صحیح بھی ہو تو بھی ایسی روایات اخبار آحاد ہونے کی وجہ سے یقین کا فائدہ نہیں دیتیں ایسی روایات کو قرآنی آیت کے ساتھ ملانے سے پورا مفہوم ظنی ہو جائے گا یقینی نہ رہے گا حالانکہ عقائد کے لئے یقین درکار ہے۔ یہاں تو روایت بھی صحیح نہیں حافظ ابن کثیرؒ اپنی تفسیر میں اس طرح کی روایات کے متعلق آیت ولایت کی تفسیر کے تحت فرماتے ہیں، **ولیس یصح شیئ منها لضعف اسانیدها و جهالة رجالها** (۶۲) ان روایات میں سے کوئی روایت بھی صحیح نہیں ہے کیونکہ ان کی سندیں ضعیف اور راوی مجہول الحال ہیں''۔ امام فخر الدین رازیؒ نے تفسیر کبیر میں اس آیت کے تحت امامیہ حضرات کا استدلال نقل کر کے فرمایا ہے **واما استد لالهم بان هذه الآية نزلت فی حق علی فهو ممنوع** (۶۳) یعنی ان لوگوں کا یہ استدلال غلط اور ناقابل قبول ہے جو یہ کہتے ہیں کہ یہ آیت حضرت علیؑ کے حق میں نازل ہوئی ہے''۔ تفسیر جلالین میں اس آیت کے متعلق لکھا ہے کہ یہ آیت حضرت عبداللہؓ بن سلام کے حق میں نازل ہوئی کیونکہ ان کا تعلق یہودی قوم سے تھا۔ کسی ضعیف یا جھوٹی روایت کا نقل در نقل کے طور پر بہت سی کتابوں میں مذکور ہونا اس کے صحیح ہونے کی دلیل نہیں مثلاً مفسر ثعلبی ضعیف اور جھوٹی روایتوں کے لانے کی وجہ سے بدنام ہے۔ ہمارے امامیہ بھائی جن روایات سے دلیل لیتے ہیں وہ ہمارے نزدیک معتبر نہیں اور ان کی اپنی کتب اور روایات ہمارے لئے حجت نہیں الغرض یہ دعویٰ ہرگز صحیح نہیں کہ سنی مفسرین سب کے سب اس آیتِ ولایت کو حضرت علیؑ کے حق میں نازل ہونا سمجھتے ہیں۔

(۳) آیت کے شروع میں ''انما'' کلمۂ حصر ہے اگر اس آیت سے ولایتِ علیؑ کو ثابت کیا جائے تو باقی گیارہ ائمہ کی ولایت کی (معاذ اللہ) نفی ہو جائے گی کیونکہ ولی وہی ہوگا جو بحالتِ رکوع زکوٰۃ ادا کرے تو باقی ائمہ کے متعلق بھی ایسی روایت پیش کرنی ہوگی۔

(۴) نماز پڑھنے والوں سے بھیک مانگ کر ان کی نماز میں خلل پیدا کرنا ایک مذموم فعل ہے

اگر سائل نابینا تھا تو اس نے حضرت علیؓ کے ہاتھ کے اشارے کو کیسے سمجھ لیا؟ اگر بینا تھا تو اس امر کی شدید ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ مسجد اور نماز کے آداب سے بالکل بے خبر اس عجیب وغریب سائل کی اصلاح کی جاتی۔ حضرت علیؓ اسے بیٹھنے کا اشارہ فرما دیتے اور نماز مکمل کرنے کے بعد انگوٹھی بھی عنایت فرما دیتے اور اسے مسجد ونماز کے ضروری آداب سے بھی متعارف کرا دیتے۔ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ سائل اضطراری حالات میں ہو اور بھوک سے بیتاب ہو کیونکہ حضرت علیؓ نے بمطابق روایت اسے کوئی خوردنی شے نہیں بلکہ انگوٹھی عطا فرمائی تھی۔ عجیب بات ہے کہ لوگ تو مسجد نبوی میں نماز پڑھ رہے ہیں اور یہ سائل بھیک مانگ رہا ہے ممکن ہے کہ سائل غیر مسلم ہو لیکن غیر مسلم کو زکوٰۃ ادا نہیں کی جا سکتی۔ اگر سائل مسلمان تھا اور کسی دوسری مسجد میں نماز ادا کر چکا تھا تو بھیک مانگنے کے لئے وہ خاص مسجد نبوی ہی میں کیوں آیا؟ کیا دیگر مساجد میں نماز پڑھنے والے اصحابِ رسول سب کے سب (معاذ اللہ) ایسے بخیل اور بے رحم تھے کہ ایک مستحق سائل کی ضرورت پوری کرنے پر مائل نہ ہوں؟

(۵) آیت میں زکوٰۃ کا ذکر ہے۔ حضرت علیؓ کا فقر وفاقہ ضرب المثل ہے۔ اگر آپ واقعی صاحبِ نصاب تھے اور آپ پر زکوٰۃ فرض تھی تو آپ کی شان سے بہت بعید ہے کہ زکوٰۃ کی ادائیگی میں تاخیر فرمائیں اور زکوٰۃ ادا کئے بغیر نماز میں شامل ہوں۔ بغیر کسی قوی قرینے کے زکوٰۃ سے نفلی صدقہ مراد نہیں لیا جا سکتا۔

(۶) حضرت ابوبکر صدیقؓ نے غزوہ تبوک میں گھر کا سارا مال دے دیا۔ حضرت عمرؓ نے گھر کا آدھا مال دیا۔ غزوۂ تبوک کے لشکر ''جیش عسرۃ'' (تنگ دستی والے لشکر) کے لئے حضرت عثمان غنیؓ نے بھاری مصارف مہیا فرمائے۔ ادھر حضرت علیؓ ہیں کہ انہوں نے اپنے ذمہ فرض زکوٰۃ میں پانچ سات ماشے کی انگوٹھی ایک سائل کو دی جس سے انہیں ہمارے بھائیوں کے بقول ولایت اور خلافت بلافصل حاصل ہوگئی۔ لیکن دیگر تینوں اصحاب کو بقول ہمارے امامیہ بھائیوں کے ولایت وخلافت تو کیا حاصل ہونا تھی وہ تو (معاذ اللہ) ایمان سے بھی محروم رہے حالانکہ ہمارے ان بھائیوں کے نزدیک اللہ پر عدل بھی ''واجب'' ہے۔ حضرت علیؓ کی زکوٰۃ سے تو صرف ایک فرد کو فائدہ پہنچا ہوگا بلکہ پہنچا ہی نہیں جیسا کہ آئندہ سطور میں واضح ہوگا۔ اس کے برعکس مذکورہ اصحابِ ثلاثہ کے صدقات سے اسلام کی حفاظت ہوئی۔ مسلمانوں کو فائدہ پہنچا دشمن مثلاً قیصرِ روم مرعوب ومغلوب ہوا۔

(۷) کیا نماز میں بحالتِ رکوع ایک انگوٹھی زکوٰۃ میں ادا کر کے ''ولایت وخلافت بلافصل''

حاصل کر لینا صرف حضرت علیؓ کے ساتھ خاص ہے یا دیگر حضرات بھی اس نسخہ سے فائدہ اٹھانے کے مجاز تھے؟ اگر کہا جائے کہ ضروری نہیں جو کوہِ طور پر جائے وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرح کلیم اللہ اور رسول بن جائے تو غور کیجئے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کوہ طور پر جانے کو بطور خبر اور واقعہ بیان کیا جاتا ہے نہ کہ اسے بطور دلیلِ نبوت پیش کیا جاتا ہے جبکہ بحالتِ رکوع زکوٰۃ ادا کرنے کے مبینہ واقعے کو حضرت علیؓ کے حق میں بطور دلیلِ ولایت پیش کیا جارہا ہے۔ چنانچہ دوسروں کا راستہ روکنے کے لئے یہ کہا گیا کہ سائل انسان نہیں بلکہ فرشتہ تھا۔ اصول کافی میں ہے۔ والسائل الذی سأل امیر المؤمنین علیہ السلام فمن الملئکۃ. (۱/۶۴) ''جس سائل نے امیر المومنین سے سوال کیا تھا وہ فرشتوں میں سے تھا'' ظاہر ہے کہ ہر شخص تو فرشتوں کے ساتھ رابطہ پیدا کرنے سے رہا چنانچہ امامیہ تفسیر ''صافی'' میں ہے۔ روی عن عمر ابن الخطاب انہ قال واللہ لقد تصدقت باربعین خاتما وانا راکع لینزل فی مانُزِل فی علیٍ فما نُزل (۲/۶۴) ''عمر بن خطاب سے مروی ہے انہوں نے کہا اللہ کی قسم! میں نے تو حالتِ رکوع میں چالیس انگوٹھیاں خیرات میں دی ہیں تاکہ میرے حق میں بھی کوئی ایسی ہی آیت نازل ہو جیسے حضرت علیؓ کے بارے میں نازل ہوئی مگر کچھ نہ ہوا'' یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا رسول اکرم ﷺ کو بھی حضرت عمرؓ کے اس بیکار مشغلے کا علم تھا یا نہیں تھا؟ اگر نہیں تھا تو امامیہ مفسروں اور راویوں کو اس کا علم کہاں سے اور کیسے ہو گیا؟ اگر تھا تو رسولِ اکرمؐ نے حضرت عمرؓ کو منع کیوں نہ فرمایا اور یہ کیوں نہ واضح فرمایا کہ حضرت علیؓ نے تو اپنی انگوٹھی ایک فرشتے کو دی تھی اور تم انسانوں کو یکے بعد دیگرے کئی انگوٹھیاں دے کر اپنا وقت اور سرمایہ ضائع کر رہے ہو؟ اگر کسی کے قول وفعل پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یوں خاموش رہیں تو اسے تقریر رسول کہا جاتا ہے جو حدیث کی ایک قسم ہے پس حضرت عمرؓ کا یہ فعل بیکار نہ رہا۔ شاید اسی لئے وہ حضرت علیؓ سے پہلے خلیفہ مقرر ہوئے کیونکہ حضرت علیؓ کی ایک انگوٹھی کے مقابلے میں انہوں نے چالیس انگوٹھیاں دی تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس انگوٹھی والے معاملے میں حضرت علیؓ کی آزمائش مقصود تھی جس میں وہ پورے اترے لیکن ہمارے بھائیوں کا دعویٰ ہے کہ بشمول سیدنا حضرت علیؓ تمام ائمۂ کرام رضوان اللہ علیہم غیب دان یعنی عالم ما کان وما یکون تھے۔ پس حضرت علیؓ کو پہلے ہی سے معلوم تھا کہ زکوٰۃ میں انگوٹھی دینے سے انہیں ولایت وامارت بلکہ خلافت بلافصل حاصل ہو جائے گی تو اس آزمائش کی قدر واہمیت ہی کیا رہی؟ اگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو پہلے سے ہی معلوم ہوتا کہ ان کے صاحبزادے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی گردن پر ان کی چھری نہیں چلے گی بلکہ پلا پلایا دنبہ مل جائے گا یا کوئی اور نعمت

حاصل ہوگی تو سوچا جائے یہ کیسی آزمائش ہے؟ سائل کو فرشتہ قرار دینے سے بہت سی پیچیدگیاں تو دور ہوگئیں لیکن نئی پیچیدگی یہ پیدا ہوئی کہ قرآن کریم میں مذکور مصارفِ زکوٰۃ میں فرشتوں کا کوئی ذکر نہیں پھر فرشتہ تو انسانی خوراک ولباس کا محتاج نہیں۔ خدا جانے حضرت علیؓ کی یہ زکوٰۃ فرشتے نے کسے دی روایت اس بارے میں خاموش ہے جب کہ اصحاب ثلاثہ کے صدقات اور ان میں حضرت عمرؓ کی بطور خاص چالیس انگوٹھیاں انسانوں کے کام آئیں۔

(۸) اصحابِ ثلاثہ کے بھاری صدقات کے مقابلے میں سیدنا حضرت علیؓ کی ایک انگوٹھی کو دیکھا جائے تو شدت سے یہ ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ انگوٹھی کی مالیت میں اضافہ کیا جائے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے لئے روایات بتدریج وضع کی گئیں۔ شیعہ مفسر ملاّ مفتح کاشانی نے تفسیر منہج الصادقین میں انگوٹھی والے واقعے کے ضمن میں یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ رسول خدا نے سائل سے پوچھا کچھ ملا'' تو سائل نے جواب دیا کہ ہاں مجھے چاندی کی انگوٹھی دی ہے اور اسی تفسیر میں آگے چل کر لکھا ہے''**وخاتم عقیق خودرا که درانگشت مبارک داشت به سائل داد** (۶۵)''عقیق کی انگوٹھی جو آپ کی مبارک انگلی میں تھی سائل کو عطا فرمائی''۔ مناقب شہر بن آشوب میں ہے۔**ھل اعطاک احدشیا قال نعم خاتم فضة وفی روایة خاتم من ذھب** (۶۶)'' کیا تجھے کسی نے کچھ دیا؟ اس نے کہا ہاں! چاندی کی انگوٹھی اور ایک روایت کے مطابق سونے کی انگوٹھی دی ہے'' یہاں راویوں کو یہ خیال بھی نہ رہا کہ سونے کی انگوٹھی مردوں کے لئے حرام ہے ظاہر ہے کہ انگوٹھی چاندی کی بجائے سونے یا قیمتی عقیق کی بھی قرار دی جائے تو بھی پانچ سات ماشے کے وزن کی انگوٹھی کی قیمت پھر بھی کچھ زیادہ نہیں بنتی اس لئے وزن بڑھانے کے لئے یہ روایت لائی گئی جو کتاب'' مجمع البحرین ومطلع النیرین'' میں لفظ'' ولاء'' کے حاشیہ پر ہے۔**رُوی عن الصادق ان الخاتم الذی تصدق به امیر المومنین وزن حلقته اربعة مثاقیل فضة و وزن فصه خراج الشام ستة مائة جمل فضة واربعة اجمال من الذھب وھو بطوار بن الحران قتله امیر المومنین واخذا الخاتم من اصبعه** (۶۷)''یعنی امام جعفر صادقؒ سے روایت ہے کہ جو انگوٹھی حضرت علیؓ نے صدقے میں دی تھی اس کے حلقے کا وزن چار مثقال چاندی کے برابر تھا اور اس کے نگینے کا وزن شام کے خراج کے برابر تھا جو چھ سو اونٹ چاندی اور چار اونٹ سونے کے برابر بنتا ہے اور یہ انگوٹھی حضرت علی نے (ایک شخص) بطوار بن حران کو قتل کر کے اس کی انگلی سے اتار کر حاصل کی تھی''۔ اس روایت سے انگوٹھی کے کم قیمت ہونے کے اشکال کا ازالہ تو بڑی حد تک ہو

جاتا ہے لیکن یہ روایت یقیناً جذباتی کیفیت میں بنائی گئی لہذا زیادہ مفید ثابت نہیں ہوسکتی تھی کہ انسانی انگلی اتنے بڑے وزن کی عقلاً متحمل نہیں ہوسکتی لہذا اسکا متبادل تجویز کرنا ضروری تھا چنانچہ اصول کافی میں ہے۔ فجاء السائل فقال السلام علیک یا ولی الله و اولیٰ بالمومنین من انفسهم تصدق علی مسکین فطرح الحلة علیه واومأ بیده اِن احملِ (۶۸) یعنی سائل آیا اور کہا اے اللہ کے ولی اور جسے مومنوں پر ان کی ذات سے بھی زیادہ اختیار ہے، تم پر سلام ہو اس مسکین کو صدقہ دے تو آپ نے چادر اس کی طرف پھینک دی اور اپنے ہاتھ سے اشارہ کیا کہ اسے اٹھالو' روایت کے جھوٹے ہونے کے لئے یہی کافی ہے کہ قرآن کریم کی رو سے اولیٰ بالمؤمنین صرف اور صرف رسول اکرم ﷺ کا وصف ہے پھر بھی ظاہر ہے کہ چادر بھی قیمتی ہونی چاہئے لہذا تفسیر صافی میں اور روایت موجود ہے۔ وکان امیر المومنین فی صلوٰة الظهر و قد صلی رکعتین وهو راکع علیه حلة قیمتها الف دینار (۶۹) ''یعنی امیر المومنین حضرت علیؓ ظہر کی نماز میں تھے اور دو رکعت ادا کر کے حالتِ رکوع میں تھے آپ پر ایک چادر تھی جس کی قیمت ایک ہزار دینار تھی'' جب مطلق نماز کا ذکر ہو تو ذہن فوراً فرض نماز کی طرف جاتا ہے اگر یہ فرض نماز تھی تو یقیناً دوسرے اصحاب کے ہمراہ حضرت علیؓ رسول اکرم ﷺ کی اقتداء میں نماز باجماعت ادا کر رہے ہوں گے اور آپ کی کوشش ہوتی ہوگی کہ صفِ اول میں رسول اکرم ﷺ سے قریب ترین کھڑے ہوں۔ مردوں کے پیچھے بچوں اور پھر عورتوں کی صفیں ہوتی تھیں۔ تو سائل عورتوں، بچوں اور مردوں کی صفوں کو چیرتا ہوا اور پھلانگتا ہوا حضرت علیؓ تک پہنچا ہوگا بالفرض کسی وجہ سے حضرت علیؓ مردوں کی کسی صف میں انتہائی دائیں یا بائیں جانب خلافِ معمول کھڑے ہوں تو بھی سائل عورتوں اور بچوں کی صفوں سے آگے نکل کر ہی حضرت علی تک پہنچ سکتا تھا غالباً اسی طرح کے تمام اشکالات سے بچھا چھڑانے کے لئے سائل کو فرشتہ قرار دیا گیا جو انسانوں کے لئے مجوزہ شریعت کا پابند نہیں اور سیدھا آسمان سے اتر کر حضرت علیؓ کے قریب آگیا ہوگا۔ لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ دیگر اصحابِ رسول کی زکوٰۃ اور صدقات سے مسلمان فائدہ اٹھاتے تھے لیکن حضرت علیؓ کی زکوٰۃ ایک فرشتہ لے اڑا اور کہیں غائب ہوگیا خواہ یہ زکوٰۃ ایک انگوٹھی تھی یا چادر تھی۔ تو یہ تمام تکلفات بالآخر بے مقصد ہی ٹھہرتے ہیں۔

(۹) زیر بحث آیتِ ولایت میں رکوع سے نماز والا رکوع مراد لیا جائے تو اسے اقامتِ صلوٰۃ سے بطور خاص یہاں بھی اور سورہ بقرہ میں بھی علیحدہ ذکر کرنے میں ایک حکمت یہ بھی ہے کہ نماز میں قیام اور قعدہ دونوں اللہ تعالیٰ کے لئے ہی ہیں ''یقیمون'' میں اشارہ قیام کی طرف بھی ہے اور قعدہ یعنی بیٹھنے

کے لئے انسان کو جھکنا تو پڑتا ہی ہے اللہ تعالیٰ نے اس جھکنے کو بھی یعنی رکوع کو بھی ایک عبادت قرار دیا جو سجود اور قعدہ کا پیش خیمہ ہے۔

(۱۰) انگوٹھی والی اس رنگا رنگ کی روایت پر اصول روایت اور درایت کے تحت قدرے تفصیلی بات ہو چکی اس آیت کا سیاق وسباق بھی ایسی روایات کی نفی کر رہا ہے اللہ کا کلام بے ربط نہیں کہ بے ربطی عیب ہے اور اللہ ہر عیب سے پاک ہے۔ الغرض آیتِ ولایت سے کسی کی بھی خلافت بلافصل تو ایک طرف رہی، خلفائے راشدینؓ کی مطلق خلافت کا ہی اس آیت سے ثابت کرنا کچھ ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص آیت الکرسی سے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کا سیف اللہ ہونا ثابت کرے۔

(۱۱) یہاں یہ بھی یاد رہے کہ مسجد میں فرض نماز باجماعت ادا کی جاتی ہے جبکہ سنن ونوافل کا گھر میں پڑھنا افضل ہے اس سلسلے میں احادیث رسول موجود ہیں (۷۰) لہٰذا اگر مان لیا جائے کہ انگوٹھی والا واقعہ پیش آیا تھا تو اس صورت میں جو مفاسد پوشیدہ ہیں ان کی وضاحت کی جا چکی ہے اگر اسے انفرادی نماز بھی قرار دیا جائے تو بھی اشکالات زیر بحث لائے جا چکے ہیں الغرض ایسی روایات جو اصول روایت ودرایت کا ذرا سا بھی بوجھ برداشت نہ کر سکیں ان سے عقائد ثابت نہیں ہو سکتے۔ ایسے افسانے دلچسپ تو ہیں لیکن ان پر ''دین'' کا لیبل لگانا افسوسناک ہے۔ نیز یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ اگر انگوٹھی والی یا چادر والی روایت درست ہے تو حضرت علیؓ نے اتنے اہم واقعے کو اپنی خلافت بلافصل کے استدلال میں پیش کیوں نہیں فرمایا۔؟

(ب) بحوالہ آیتِ تبلیغ، حدیث مولاۃ وحدیث ثقلین:-

سورۂ مائدہ میں ہے۔ یٰاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ط وَاللّٰهُ یَعْصِمُکَ مِنَ النَّاسِ (۱) ''یعنی اے رسول جو تیرے رب کی طرف سے تجھ پر نازل کیا گیا ہے اسے (لوگوں تک) پہنچا دے اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو آپ نے رسالت کا حق ادا نہ کیا اور اللہ آپ کو لوگوں سے بچائے گا''

ہمارے امامیہ بھائی یہ کہتے ہیں کہ حجۃ الوادع سے واپسی پر آنحضرت ﷺ جب مقام غدیر خم پر پہنچے تو اس غیر آباد جگہ سے درخت اور جھاڑیاں وغیرہ کٹوا کر وہاں قیام فرمایا۔ جبریل امین اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت علیؓ کی خلافت بلافصل کا پیغام لے کر نازل ہوئے اور بارِ رسالت ﷺ میں عرض کیا

کہ آپ اعلان فرما دیجئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عذر فرمایا کہ خلافتِ علیؑ کا اعلان سن کر لوگ کہیں جدال وقتال پر آمادہ نہ ہو جائیں چنانچہ جبریل امین آپ کے جواب میں یہ آیت لے کر نازل ہوئے پھر آپ نے یوں اعلان فرمایا۔ من کنت مولاہ فھذا علی مولاہ اللھم وال من والاہ و عادِ من عاداہ۔ ''جس کا میں مولیٰ ہوں یہ علیؑ بھی اس کے مولیٰ ہیں اے اللہ اسے دوست رکھ جو علیؑ کو دوست رکھے اور اسے دشمن رکھ جو علیؑ کو دشمن سمجھے۔ یہ حدیث اہل سنت کی کتب میں موجود ہے اور اسے حدیث مُوالاۃ کہا جاتا ہے۔ یہ روایت بھی ہے جو متعدد کتب میں الفاظ کے قدرے تغیر کے ساتھ موجود ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ عنقریب مجھے اللہ کی طرف سے بلاوا آنے والا ہے میں تمہارے اندر ثقلین (دو بھاری چیزیں) چھوڑے جا رہا ہوں۔ قرآن اور میری عترت اہل بیت، یہ دونوں ہرگز جدا نہیں ہوں گے یہاں تک کہ حوض کوثر پر مجھ سے آملیں گے۔ تم ان دونوں سے تمسک کرو یعنی مضبوطی سے تھامے رہو تو تم ہرگز گمراہ نہیں ہو گے۔ یہ حدیث، حدیث ثقلین کے نام سے مشہور ہے۔ اگرچہ اس حدیث کا متن اور طرح بھی ہے تاہم ہمارے امامیہ بھائی اسی متن پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں ثقلِ ثانی (دوسری بھاری چیز) عترتِ رسول اہل بیت سے مراد بارہ ائمہ کرام ہیں جو رسول اکرم ﷺ کی عترت (اولاد) سے ہیں ان کی اطاعت فرض ہے اور یہ سب معصوم عن الخطا ہیں۔ قرآن کے ساتھ انہی سے تمسک ضروری ہے۔ ہم آیتِ تبلیغ، حدیث موالاۃ اور حدیث ثقلین سب کو زیر بحث لاتے ہیں تاکہ صحیح صورتِ حال بالکل نکھر کر سامنے آجائے۔

آیتِ تبلیغ

(۱) امامیہ بھائیوں کی چوٹی کی حدیث کی کتاب اصولِ کافی میں ہے۔ قال ابو جعفر علیہ السلام ولایۃ اللہ اسرّھا الی جبریل و اسرّھا جبریل الیٰ محمد صلی اللہ علیہ و آلہ واسرھا محمد الیٰ علی علیہ السلام و اسرھا علی الیٰ من شاء ثم انکم تذیعون ذالک (۱۷) ''یعنی امام باقر علیہ السلام نے فرمایا کہ ولایتِ الٰہی یعنی امامت کا مسئلہ اللہ نے بطورِ راز کے جبرئیل سے بیان کیا اور جبرئیل نے بطورِ راز کے محمد ﷺ سے بیان کیا اور محمد ﷺ نے بطورِ راز کے علی علیہ السلام سے بیان کیا۔ اور علی علیہ السلام نے بطورِ راز کے جس سے چاہا بیان کیا مگر تم لوگ ہو کہ تم اسے مشہور کر رہے ہو'' اسی اصول کافی میں آیت تبلیغ کے متعلق امام جعفر صادقؒ کی حدیث ابوالجارود نے یہ

بیان کی ہے. ثم نزلتِ الولایة وانما اتاه ذالک فی یوم الجمعة بعرفة ...... فَنَزَلَتْ یَاَیُّھَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَبِّکَ الایة (۷۲)''یعنی مسئلہ ولایت (امامت) نازل ہوا یہ جمعہ کا دن اور عرفہ کا مقام تھا روایت کے آخر میں ہے کہ اس موقع پر یہ آیت یایھا الرسول بلغ ما انزل الیک الخ یعنی آیت تبلیغ نازل ہوئی۔ اصول کافی کی مذکورہ بالا پہلی روایت سے معلوم ہوا کہ عقیدۂ امامت کا سخت اخفاء مطلوب ہے، یہ اللہ کے رازوں میں سے ایک راز ہے اگر اس کا اخفا مقصود تھا تو تبلیغ کیسی اور اگر تبلیغ مقصود تھی تو اخفا کیسا؟ سرکاری رازوں کا افشا تو بالاتفاق سنگین جرم ہے لہذا ثابت ہوا کہ آیت تبلیغ کا ولایت وامامت کے اعلان سے دور دور کا بھی کوئی تعلق نہیں چنانچہ اصول کافی ہی کی مذکورہ بالا دوسری روایت سے یہ واضح ہورہا ہے کہ آیت تبلیغ یوم عرفہ یعنی ۹ ذی الحجہ ۱۰ ہجری بروز جمعۃ المبارک نازل ہوئی تھی یہ غدیرخم کے مقام پر نازل نہیں ہوئی۔ اہلسنت کی کتب میں اس آیت کے غدیرخم کے مقام پر نازل ہونے کی روایات میں عطیہ عوفی، کلبی جیسے رافضی اور ابوبکر بن عیاش جیسے ضعیف اور انتہائی غیرمعتبر راوی موجود ہیں پھر ان روایات کی ہمارے بھائیوں کے نزدیک اصول کافی کی روایت کے مقابلے میں بھلا کیا حیثیت ہوسکتی ہے؟

(۲) اگر آیت میں ''ما اُنزل الیک'' سے حضرت علیؓ کی ولایت وامامت کی وحی مراد ہے تو ''اُنزِلَ'' ماضی مجہول کا صیغہ ہے یعنی امامتِ علیؓ کی وحی پہلے نازل ہوچکی تھی اب اس کی تبلیغ کی تاکید کی جارہی ہے لیکن پورے قرآن مجید میں کہیں بھی امامتِ علیؓ کا اشارہ تک نہیں ہے اگر کہا جائے کہ یہ قرآنی وحی نہیں بلکہ وحی غیرمتلو تھی تو تعجب ہے کہ ولایت علیؓ کی اطلاع تو وحی غیرمتلو (حدیث) سے ہوتی ہے لیکن اس کی تبلیغ اور اعلان کا مبہم حکم وحی متلو (قرآنی وحی) کے ذریعہ ہوتا ہے اور اس کا غدیرخم کے موقع پر مبینہ اعلان پھر وحی متلو کے ذریعہ نہیں بلکہ وحی غیرمتلو سے ہوتا ہے یہ تمام تکلفات اور تصنعات بتارہے ہیں کہ آیت تبلیغ کا ولایت وامامتِ علیؓ سے تعلق بلاوجہ تکلف کرکے جوڑا جارہا ہے ورنہ وحی متلو (قرآن) کے ذریعہ سیدھا اور صاف اعلان کردیا جاتا کہ حضرت علیؓ رسول اکرم ﷺ کے بعد خلیفہ وامام ہیں۔ دیگر عقائد توحید، رسالت اور آخرت کا ذکر قرآن کریم میں نہایت وضاحت اور صراحت سے ایک دو جگہ نہیں بلکہ جابجا اور بار بار کیا گیا ہے۔ آخر عقیدہ امامت کے اعلان کے لئے یہ پیچیدہ طریقہ کیوں اختیار کیا گیا؟ چونکہ اللہ کا کلام اس طرح کے کسی بھی عیب سے پاک ہے لہذا آیت تبلیغ سے اخذ کیا جانے والا زیربحث مفہوم درست نہیں۔

(۳) اگر مان لیا جائے کہ آیت تبلیغ حضرت علیؓ کے حق میں نازل ہوئی تھی تو بھی اس سے ان

کی خلافت بلافصل ثابت نہیں ہوتی بلکہ مطلب یہ ہوسکتا ہے کہ حضرت علی سے عداوت نہ رکھی جائے بلکہ ان سے قلبی محبت ہونی چاہئے چنانچہ حدیث مُوالاۃ میں ''اللھم وال من والاہ و عاد من عاداہ'' کے الفاظ قابل غور ہیں جن کا مفہوم یہ ہے کہ اے اللہ جو اس (علیؓ) کو دوست رکھے تو بھی اسے دوست رکھ اور جو اس سے دشمنی کرے تو بھی اس کا دشمن ہو جا۔

(۴) رسول اکرم ﷺ کو توحید، رسالت اور آخرت کے عقائد کی برملا تبلیغ کا حکم ملا تو آپ نے ان عقائد کی تبلیغ میں ہرگز کوئی خوف محسوس نہیں کیا حالانکہ آپ اور آپ کے ساتھیوں کو شدید تکالیف اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ مثلاً طائف میں آپ نے پتھر کھائے، زخمی ہوئے اور سخت اذیت اٹھائی۔ آپ کے اصحاب کو مشرکین مکہ نے طرح کے ایذائیں دیں انہیں دو بار ہجرت حبشہ اور پھر ہجرت مدینہ پر مجبور کیا بعد میں ان پر جنگیں مسلط کیں لیکن انہوں نے ان تمام تکالیف کو نہایت خندہ پیشانی سے قبول کیا اور دین حق پر قائم ودائم رہے۔ آخر حضرت علیؓ کی خلافت بلافصل کیوں ایسا حساس مسئلہ تھا کہ ناحق یہ فرض کرلیا گیا کہ رسول اکرم ﷺ اس کی تبلیغ سے خائف تھے۔ آپ کے ساتھیوں نے اسلام کی خاطر تمام تکالیف برداشت کرلیں۔ گھر بار، بیوی بچے اور اموال تک چھوڑ کر مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کی۔ ان مہاجرین کے مظلوم ہونے کی شہادت خود قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے دی ہے (۷۳) اور یہ شہادت بھی دی ہے کہ یہ مہاجرین اللہ اور اس کے رسول (کے دین) کی مدد کرتے ہیں اور یہ سچے لوگ ہیں (۷۴) انہوں نے کفر واسلام کی جنگوں میں اپنی اور اپنے اعزہ واقارب کی جانیں قربان کردیں مال خرچ کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جو لوگ ایمان لائے، جنہوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا اور جن (انصار مدینہ) نے ان (مہاجرین مکہ) کو ٹھکانا دیا اور ان کی مدد کی یہ سب پکے مومن ہیں ان کے لئے مغفرت اور رزق کریم ہے (۷۵) آخر عقیدۂ امامت ان کے لئے کیوں قابل قبول نہ تھا؟ کیا اللہ تعالیٰ بھی (معاذ اللہ) صحابہ کرام سے خائف تھا کہ عقائد توحید ورسالت وغیرہ تو بار بار نہایت تفصیل سے بیان فرمائے لیکن قرآن کریم میں اس طرح کی ایک آیت یا آیت کے حصہ کو کوئی جگہ نہ ملی کہ ہم نے علیؓ کو زمین میں خلیفہ اور امام بنایا ہے؟ اگر ایسا ہوتا تو نہ تو حدیث مُوالاۃ اور نہ ہی حدیث ثقلین کے متواتر ہونے کی متنازعہ بحث کے دروازے ناحق کھلتے۔ اگر کہا جائے کہ حضرت علی کی تلوار سے بہت سے مشرکین مقتول ہوئے تھے اسلئے قبول اسلام کے بعد بھی لوگوں کے دلوں میں ان کے خلاف نفرت وعداوت بھری تھی تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت علیؓ نے جو کچھ بھی کیا رسول اکرم ﷺ کے حکم اور رضامندی ہی سے۔

کیا تو یہ لوگ خود رسول اکرم ﷺ کے مخالف کیوں نہ ہوئے اور انہوں نے کیوں اسلام قبول کیا؟ اگر کہا جائے کہ یہ لوگ دل سے مسلمان نہیں ہوئے تھے یعنی معاذ اللہ منافق تھے تو اس باطل نظریئے کی بھرپور مدلل تردید مقالہ ہذا کے پہلے حصے میں ہو چکی ہے۔ یہاں یہ یاد دہانی کافی ہے کہ رسول اکرم ﷺ کو کفار اور منافقین کے خلاف جہاد کرنے اور ان پر سختی کرنے کا مکرر اور تاکیدی حکم تھا۔ اگر ایسی ہی بات تھی تو آپ نے اس حکم کی تعمیل کیوں نہ کی؟ ان تمام امور پر غور کرنے سے صاف پتہ چلتا ہے کہ یہ سب خانہ ساز اور من گھڑت مفروضے ہیں جنہیں ''حقیقت'' قرار دینے کی ناکام کوشش کی جاتی ہے۔

(۵) قرآن کریم میں ''ما انزل الیک'' کے کلمات اور بھی کئی مواقع پر موجود ہیں مثلاً سورۂ بقرہ کے پہلے رکوع ہی میں ہے۔ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ (۷۶) ''یعنی (پرہیزگار لوگ وہ ہیں) جو اس (وحی پر بھی) ایمان لاتے ہیں جو تیری طرف اتاری گئی اور اس پر بھی جو تجھ سے پہلے اتاری گئی''۔ دیکھئے اس طرح کی تمام آیات میں ما انزل الیک سے پوری وحی مراد ہے جو رسول اکرم ﷺ پر اتاری گئی تو آیت تبلیغ میں مـــانـــزل الیک سے خاص مفہوم کیسے اخذ ہوا۔؟ حالانکہ یہ مسلمہ قاعدہ ہے القـرآن یفسـر بعضه بعضا یعنی قرآن کا ایک حصہ دوسرے حصے کی تفسیر کرتا ہے۔

حدیثِ مُوالاۃ:-

(۱) ''مولیٰ'' کا لفظ بہت سے معانی میں مشترک ہے لہذا کسی ایک معنی کی تخصیص کے لئے قوی قرینہ چاہئے جو خود اس حدیث کے اندر ہی موجود ہے اللّٰھم وال من والاہ ''یعنی اے اللہ تو اسے دوست رکھ جو (علی) کو دوست رکھے''۔ پس بطریق اولیٰ یہ ثابت ہو گیا کہ یہاں ''مولیٰ'' سے ''دوست'' مراد ہے۔ اس کے بعد مولیٰ کا معنی جاننے کے لئے کسی بھی جان گسل اور شدید مشقت طلب تحقیق کی ضرورت نہیں۔ اگر مان بھی لیا جائے کہ یہاں مولیٰ کا معنی حاکم ہے تو بھی اس میں ''بلافصل'' کا مفہوم کیسے داخل ہو گیا؟ علمائے دین کو لوگ ''مولانا'' کہتے ہیں تو ان سب علما کو بھی خلیفہ بلافصل تسلیم کرنا چاہئے۔ اگر واقعی یہاں مولیٰ کا معنی ''اولیٰ'' ہے تو بھی حدیث کے متن کی روشنی میں اس سے اولیٰ بالمحبۃ کا معنی لیا جائے گا یعنی قرابت دارانِ رسول میں محبت کے سب سے زیادہ اہل اور حق دار حضرت علیؓ ہیں۔ اگر حدیث موالاۃ میں ''مولیٰ'' سے خلیفہ بلافصل مراد ہے تو رسول اکرم ﷺ پر (معاذ اللہ) یہ سخت الزام آتا ہے کہ

جس امر کی تبلیغ کا آپ کو سخت تاکیدی حکم دیا گیا تھا اور مبینہ طور پر بار بار تنبیہ کی گئی تھی تو آپ نے افصح العرب والعجم ہوتے ہوئے ایسی گول مول بات کی کہ ابہام باقی رہا۔ آپ ''مولیٰ'' کا لفظ استعمال نہ فرماتے جو بہت سے معانی میں مشترک ہے۔ سیدھا یہ اعلان فرماتے کہ حضرت علیؓ میرے بعد خلیفہ بلافصل ہونگے۔ جب معاملہ عقیدے کا ہو تو اس کے اظہار کے لئے صریح اور واضح الفاظ ہونے چاہیں نہ کہ اشارات وکنایات سے کام لیا جائے چنانچہ خود بعض امامیہ علما کو بھی اس کا اعتراف ہے کہ حدیث مُوالاۃ سے حضرت علیؓ کی خلافت بلافصل صراحۃً ثابت نہیں ہوتی بلکہ اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے چنانچہ امامیہ عالم علامہ طبرسی فرماتے ہیں **اثبت حجة الله تعريضاً لاتصريحاً بقوله في وصيه من كنت مولاه فعلي مولاه** (۷۷) ''رسول اکرم ﷺ نے اللہ کی حجت (حضرت علیؓ کے امام ہونے) کو اشارے سے ثابت کیا ہے نہ کہ صراحت سے، اپنے اس قول میں جو آپ نے اپنے وصی (حضرت علیؓ) کے بارے میں فرمایا تھا۔ **من كنت مولاه فعلي مولاه**''

شرح تجرید میں بھی تسلیم کیا گیا ہے کہ حدیث موالاۃ کی امامتِ علیؓ کے مفہوم پر دلالت میں لوگوں کا اختلاف ہے **اختلفوا في دلالته على الامامة** (۷۸)

جہاں تک اہل سنت علما کا تعلق ہے محقق علما حدیثِ مؤالاۃ کو ہرگز ''متواتر'' قرار نہیں دیتے بلکہ ان کے نزدیک یہ حدیث خبر واحد کے طور پر بھی کسی صحیح سند سے ثابت نہیں، گو اس کی اسناد بظاہر زیادہ ہیں۔ حافظ زیلعی (متوفی ۷۶۲ھ) بسم اللہ بالجہر کی بحث میں لکھتے ہیں کہ نماز میں بسم اللہ اونچی آواز سے پڑھنے کی روایات اگرچہ بہت ہیں لیکن وہ سب کی سب ضعیف ہیں اور بہت سی روایات ایسی ہیں کہ ان کے راوی بہت ہیں اور ان کے طُرق یعنی اسناد متعدد ہیں مگر وہ حدیثیں ضعیف ہیں، جیسے ''حدیثِ طیر'' اور حدیث ''افطر الحاجم'' اور حدیث من کنت مولاہ فعلی مولاہ۔ آخر میں لکھتے ہیں۔۔ **بل قد لايزيد كثرة الطرق الاضعفا** (۷۹) ''یعنی بعض اوقات کثرتِ طُرق بجائے اس کے کہ نقصانِ ضعف کو پورا کرے اس ضعف کو اور بھی بڑھا دیتی ہے''۔ دیگر اکابر علما و محدثین مثلاً امام بخاریؒ، ابن ابی حاتم رازیؒ، ابراہیم الحربیؒ، ابن ابی داؤد، ابن حزم ظاہریؒ وغیرہ کو اس حدیث موالاۃ کی صحت میں کلام ہے۔ تاہم جو حضرات اس حدیث کو صحیح تسلیم کرتے ہیں تو اگر اسے متواتر بھی مان لیا جائے تو بھی اس حدیث کا صحیح مفہوم مذکور ہو چکا ہے۔ اگر یہ خبرِ واحد ہے تو ظاہر ہے خبر واحد سے عقائد ثابت نہیں ہوتے لہٰذا اس حدیث سے حضرت علیؓ کی فضیلت ثابت ہوتی ہے نہ کہ عقیدۂ امامت یا کوئی اور عقیدہ کیونکہ عقائد کے لئے جو یقین قطعی درکار

ہے اخبار آحاد سے حاصل نہیں ہوتا۔

(۲) مذکورہ اشکالات اور پیچیدگیوں کا احساس ہمارے امامیہ بھائیوں کو بھی ہوا تو انہوں نے اس کی شدید ضرورت محسوس کی کہ کوئی ایسی کہانی بھی ساتھ ملائی جائے جس سے مشکل کشائی ہو، چنانچہ آغا محمد سلطان مرزا دہلوی ریٹائرڈ ڈسٹرکٹ وسیشن جج پنجاب اپنی کتاب البلاغ المبین میں تحریر فرماتے ہیں'' آنحضرت ﷺ نے عام منادی اپنی امت میں کرادی کہ لوگ حج کے لئے تیار ہو جائیں اور رسول خدا کی معیت میں آخری حج ادا کرنے کا شرف حاصل کریں۔ یہ سننا تھا کہ لوگ جوق در جوق مدینہ منورہ میں آنا شروع ہو گئے۔ آپ نے ۲۵ رتاریخ ذی قعدہ ۱۰ ہجری کو مدینہ سے بارادہ حج کوچ فرمایا۔ آپ کے ہمراہ اس وقت ایک عظیم الشان مجمع تھا جس کی کم سے کم تعداد نوے ہزار اور زیادہ سے زیادہ ایک لاکھ چالیس ہزار بیان کی گئی ہے (اسپرٹ آف اسلام صفحہ ۱۱۳۔ تاریخ کامل ابن اثیر سیرت ابن ہشام) لیکن راستے میں یہ مجمع بڑھتا گیا کیونکہ جو لوگ بوجہ طوالت سفر مدینہ منورہ میں نہ آسکتے تھے وہ آپ سے راہ میں شامل ہوتے جاتے تھے۔ حج کے موقع پر تو یہ مجمع کئی گنا ہو گیا'' (۸۰)

''اس کے بعد آپ نے ایک خاص خیمہ نصب کرادیا جس میں حضرت علیؓ نے بیٹھ کر جناب رسول خدا کے حکم سے تمام امت سے بیعت لی اور تمام امت نے آپ کو مبارک باد دی اس میں مرد وعورت سب شامل تھے'' (۸۱) نیز تحریر فرماتے ہیں ''لہٰذا آنحضرت ﷺ نے بحکم خداوندی اپنے خلیفہ وجانشین کا اعلان بمقام غدیر خم تمام امت کے روبرو اس طریقے سے کردیا کہ پھر کسی کو جائے انکار نہ رہے'' (۸۲)

بلاشبہ حجۃ الوداع ہوا لوگوں کی بہت بڑی تعداد بھی اس میں شریک ہوئی لیکن غدیر خم کے مقام پر مبینہ بیعتِ علیؓ کے واقعہ کو صحیح تسلیم کرنے سے سیدنا حضرت علیؓ کی خلافت بلافصل کا مسئلہ حل تو کیا ہونا تھا اس میں مزید کئی لاینحل پیچیدگیاں پیدا ہو گئیں۔ درجہ ذیل نکات قابلِ غور ہیں:-

(الف) آغا صاحب نے مذکورہ کہانی کا ماخذ بیان نہیں کیا یقیناً انہوں نے اپنے متقدمین کے علمی ذخیرہ مثلاً احتجاج طبرسی وغیرہ سے استفادہ کیا ہوگا۔ مدینہ منورہ سے روانگی کے وقت کم سے کم نوے ہزار مسلمان رسول اکرم ﷺ کے ہمراہ بتائے گئے ہیں۔ راستے میں یہ تعداد بڑھتی گئی اور مبینہ طور پر بالآخر کئی گنا ہو گئی اس لئے یہ دگنی سے یقیناً زائد ہوگی جیسا کہ ''کئی گنا'' کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے۔ ہم کم سے کم تعداد بھی لیں تو یہ تین گنا تو ضرور ہوگی یعنی کل تعداد کم از کم دو لاکھ ستر ہزار نفوس (نوے ہزار کے تین گنے) پر مشتمل تھی جن سے حضرت علیؓ نے خیمہ نشین ہو کر مبینہ بیعت لی۔ اس بیعت کے لئے ہم فی

کس کم از کم نصف منٹ شمار کر لیتے ہیں تو کل وقت ایک لاکھ پینتیس ہزار منٹ صرف ہوا۔ اسے ساٹھ سے تقسیم کرنے سے کل دو ہزار دو سو پچاس گھنٹوں کی مدت برآمد ہوئی۔ انہیں چوبیس پر تقسیم کرنے سے یہ مدت تقریباً چورانوے دن بنتی ہے۔ یہ مدت تب صحیح ہو سکتی ہے کہ حضرت ایک لمحے کا بھی توقف کئے بغیر بیعت پر بیعت لیتے چلے جائیں لیکن آپ کو نیند کے لئے، ضروری بشری حوائج کے لئے، غسل اور وضو کے لئے، نمازوں کی ادائیگی کے لئے، خورد ونوش اور ہفتہ عشرہ میں بال وغیرہ ترشوانے کے لئے روزانہ کم از کم اوسطاً آٹھ گھنٹوں کا وقت تو درکار ہوگا۔ باقی کام تو ایک طرف رہے روزانہ اتنی بڑی تعداد کے لوگوں کی نماز باجماعت کا اہتمام، ان کے لئے پانی اور وضو کا انتظام ہی کوئی آسان کام نہیں۔ لہٰذا چوبیس سے آٹھ گھنٹے کم کئے جائیں اور روزانہ بیعت کے اس بھاری بھرکم فریضے کے لئے سولہ گھنٹے مختص کئے جائیں تو دو ہزار دو سو پچاس گھنٹوں کو سولہ پر تقسیم کرنے سے مدت کوئی ایک سو چالیس دن برآمد ہوگی۔ یوم غدیر کی تاریخ ۱۸ ذی الحجہ بیان کی جاتی ہے اگر ذی الحجہ محرم اور صفر کے تینوں مہینے تیس تیس دن کے لئے جائیں تو رسول اکرم ﷺ کے یوم وصال تک یہ مدت چوراسی دن بنے گی جبکہ حضرت علیؓ کو مبینہ بیعت کے لئے ایک سو چالیس دن لگے یعنی بیعت کے اختتام پر رسول اکرم ﷺ کو اس دنیا سے رخصت ہوئے چھپن دن گزر چکے تھے۔ اگر فرض کر لیا جائے کہ رسول اکرم ﷺ حضرت علیؓ کو لوگوں سے بیعت لینے کے لئے خیمے میں بٹھا کر خود مدینہ منورہ تشریف لے گئے ہوں تو جب حضرت علیؓ اس مہم سے فارغ ہو کر مدینہ منورہ پہنچے تو انہیں معلوم ہوا ہوگا کہ رسول اکرم ﷺ کو رحلت فرمائے کوئی دو ماہ ہو چکے ہیں اور حضرت ابوبکر صدیقؓ مسند خلافت پر قابض ہوئے بیٹھے ہیں۔ ان مفروضوں کے تحت یہ بھی ماننا ہوگا کہ حضرت علیؓ نے رسول اکرم ﷺ کی تجہیز وتکفین میں بھی (معاذ اللہ) شرکت نہ فرمائی جس سے توجہ ہٹانے کے لئے اس عدم شرکت کا الزام حضرت ابوبکر صدیق پر رکھ دیا گیا۔

(ب) لوگ تو فرداً فرداً بیعت کر کے رخصت ہوتے رہے لیکن حضرت علیؓ لگاتار کئی کئی گھنٹوں تک ایک ہی جگہ پر بیٹھے رہے بیعت لینے کے لئے وہ اپنا ہاتھ بار بار آگے بڑھانے اور پھیلائے رکھنے کے پابند رہے اس صورت حال کو بطور عادت نبھانا انسانی طاقت سے ماورا دکھائی دیتا ہے۔

(ج) اس عظیم مجمع میں سے جن لوگوں نے آخری دنوں میں حضرت علیؓ کی بیعت کی ہوگی وہ کوئی ساڑھے چار ماہ تک مسلسل غدیر خم کے مقام پر ہی بیٹھے رہے۔ وہاں کوئی من وسلویٰ تو اترتا نہیں تھا معلوم نہیں کہ اس اجاڑ اور ویران جگہ پر لوگوں کے خورد ونوش کا کیا انتظام تھا؟ نہانے، پینے اور وضو کے

لئے پانی کہاں سے آتا تھا؟ دھوپ اور موسم کی سختیوں سے بچنے کے لئے مسلسل خیموں میں قیام آسان نہیں۔ اتنی بڑی تعداد کے لوگوں کا نماز باجماعت کا انتظام بھی کارے دارد، ایسی جگہ کو مبینہ بیعت کے لئے منتخب کرنا ہی سمجھ سے بالاتر ہے آخر مدینہ منورہ میں اس طرح کا اہتمام کیوں نہیں ہوسکتا تھا لوگوں کو اور خود حضرت علیؓ کو ناحق تکلیف پہنچانے میں کونسی مصلحت پوشیدہ تھی؟ خلفائے راشدینؓ کی بیعت پر یہ اشکالات وارد نہیں ہوتے مثلاً حضرت ابوبکر صدیقؓ نے لوگوں سے بیعت کسی اجاڑ اور غیر آباد مقام پر نہیں لی۔ اور نہ ہی کسی خاص مدت کے یا بلا وقفہ لگاتار بیعت لئے جانے کے وہ پابند تھے پھر بیعت کرنے والے مدینہ منورہ کے مہاجرین وانصار لاکھوں کی تعداد میں نہیں تھے۔ یہ بیعت کئی مہینوں تک بھی مختلف اوقات، مختلف مواقع اور نشستوں میں ہوتی رہی ہو تو اس میں کوئی اشکال نہیں اگر یہ روایت درست بھی مان لی جائے کہ حضرت علیؓ نے حضرت ابوبکرؓ کی بیعت چھ ماہ بعد کی تھی تو بھی ہرگز قابل اعتراض نہیں۔ غزوہ حدیبیہ کے موقع پر بیعت رضوان میں شامل صحابہ کرام چودہ سو کے قریب تھے، تعداد جتنی کم ہوگی بیعت کے لئے فی کس مدت بھی کم ہوگی، اگر یہ مدت بیس سیکنڈ فی کس لی جائے تو کوئی آٹھ گھنٹے اور اگر تیس سیکنڈ فی کس لی جائے تو کوئی بارہ گھنٹے بنتی ہے۔ ببول کے درخت کے نیچے یہ بیعت ایک میں نہ سہی تو دو تین نشستوں میں بآسانی ممکن ہے۔

(د) غزوۂ بدر، غزوۂ احد جیسے واقعات صرف ایک روز میں ہوئے اس کے باوجود طبقاتی تو اتر سے امت تک منتقل ہوئے حضرت علیؓ کی لوگوں سے یہ مبینہ بیعت کوئی پانچ ماہ جاری رہی لیکن دوسروں کا تو کیا ذکر، ہمارے بہت سے امامیہ بھائی بھی اس سے بے خبر ہیں۔

(ھ) اتنی بڑی تعداد میں لوگوں کا یہ میلہ کوئی پانچ ماہ تک لگا رہا پھر بھی یہ لوگ (معاذ اللہ) ایسے بے وفا اور عہد شکن ثابت ہوئے کہ اس بیعت کو سراسر فراموش کر کے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ساتھ ہو لئے۔ اس صورت میں یہ لوگ کسی ادنی سے ادنیٰ رعایت اور نرمی کے بھی مستحق نہ ہو سکتے تھے لیکن ہمیں بتایا یہ جاتا ہے کہ حضرت علیؓ نے اسد اللہ الغالب وہوالغالب علیٰ کل غالب ہوتے ہوئے بھی ان کے خلاف جہاد اس لئے نہیں کیا کہ روم وایران کی حکومتیں اسلام کو ختم کرنے کے درپے تھیں۔ ادھر منافقین اسلام کی جڑوں کو کھوکھلا کر رہے تھے اس لئے آپ نے مسلمانوں کے بہترین مفاد میں یہ سب کچھ ٹھنڈے پیٹوں برداشت کیا۔ ذرا سوچئے حضرت علیؓ کون سے مسلمانوں کی اتنی رعایت فرما رہے تھے؟ ان (معاذ اللہ) نام نہاد مسلمانوں سے تو اتنا بھی نہ ہوسکا کہ غدیر خم کے مقام پر خیمہ نشین حضرت علیؓ کو اتنا ہی بتا دیتے کہ رسول

اللہ ﷺ رحلت فرما چکے ہیں۔ ہاں بقول ہمارے بھائیوں کے حضرت علیؓ عالم الغیب اور عالم ما کان و ما یکون بھی تھے پھر بھی لگاتار غدیر خم کے مقام پر بیعت لئے جانے کا کوئی پانچ ماہ کی مدت پر محیط آپ کا عمل سمجھ سے بالاتر ہے۔ نیز یہ امر بھی حیرت انگیز ہے کہ ایسے (معاذ اللہ) بے وفا لوگوں کو رسول اکرم ﷺ کی معیت میں حج کرنے کا آخر اتنا شوق کیوں تھا؟

(و) مذکورہ دلچسپ مگر جھوٹی کہانی کی ان خرابیوں کا ادراک گو آغا محمد سلطان مرزا صاحب کو نہ ہوا ہو لیکن اس سے قبل بعض امامیہ علما مثلاً ملاّ باقر مجلسی کو ان کا بجا طور پر احساس ہوا تو انہوں نے لوگوں کی تعداد اور بیعت لینے کی مدت کو کم کرنے کی ضرورت محسوس کی چنانچہ آپ نے یہ تعداد بیک جنبش قلم ستر ہزار اور مدتِ بیعت تین دن کر دی۔ (۱/۸۳) گو ان دنوں آج کل کی طرح کیلکولیٹر وغیرہ کی سہولتیں دستیاب نہ تھیں لیکن اگر ملاّ مجلسی تھوڑی سی زحمت اٹھا کر صحیح حساب کر لیتے تو کہانی جھوٹی ہونے کے باوجود خلاف عقل نہ رہتی۔ مذکورہ بالا حساب سے ستر ہزار لوگوں سے بیعت لینے میں تین دن نہیں بلکہ چھتیس (مکرر عرض ہے کہ) چھتیس دن لگتے ہیں۔ اگر اس طرح کی روایات اور کہانیوں سے عقائد ثابت ہوتے ہوں تو اسلامی اور غیر اسلامی عقائد میں آخر فرق ہی کیا رہا؟

حدیثِ ثقلین:-

(۱) اگر حدیث ثقلین کا واقعی یہی مطلب ہے کہ قرآن کریم اور بارہ ائمہ کرام سے تمسک کیا جائے۔ ان ائمہ کرام کو معصوم عن الخطا، منصوص من اللہ اور مفترض الطاعۃ قرار دیا جائے تو زیر بحث حدیث میں جس قرآن کی بات کی گئی ہے وہ یا تو وہی قرآن ہے جو ہمارے ہاتھوں میں ہے یا کوئی اور قرآن ہوگا، اگر یہی قرآن ہے تو اسے سمجھنے کے لئے کسی خاص امام معصوم اور حجت (اتھارٹی) کی ضرورت ہے یا نہیں۔ اگر نہیں تو یہی حق ہے۔ اگر ضرورت ہے تو ہمارے اثنا عشری بھائیوں کے بقول یہ امام معصوم سینکڑوں برس سے غائب ہیں یعنی قرآن تو موجود ہے لیکن امام غائب ہے اس صورت میں قرآن کو سمجھنے کے لئے امام سے تمسک کیسے کیا جا سکتا ہے؟ اگر امام کے نام نہاد نائبین سے ہی رجوع کرنا ہے تو یہ اگر معصوم ہیں تو معصومین بارہ یا چودہ نہ رہے بلکہ لاتعداد ہو گئے اگر یہ غیر معصوم ہیں تو ثابت ہوا کہ قرآن کریم کسی بھی غیر معصوم عالم دین سے سیکھا اور سمجھا جا سکتا ہے۔ اگر کہا جائے کہ حدیث ثقلین میں مذکور قرآن موجودہ قرآن نہیں بلکہ کوئی اور قرآن ہے تو معاملہ اور بھی پیچیدہ ہو جاتا ہے یعنی قرآن اور امام دونوں غائب ہیں تو لوگ

ان سے تمسک کیسے کریں گے؟

(۲) اس دنیا سے رحلت فرمانے کے بعد رسول اکرم ﷺ لوگوں پر حجت (اتھارٹی) رہے یا (معاذ اللہ) نہیں رہے۔ اگر آپ حجت ہیں اور یہی حق ہے تو آپ کے بعد کسی اور کو حجت اور شارع قرار دینا ظلم ہے۔ جبکہ آپ خاتم النبیین ہیں اور دین بھی کامل ہو چکا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں بعثت انبیاء علیہم السلام کا مقصد یہ بیان کیا گیا ہے۔ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ (۸۳/۲) تاکہ لوگوں کے لئے (اللہ کی طرف سے) رسولوں (کی بعثت) کے بعد کوئی حجت (دلیل یا الزام) باقی نہ رہے'' یعنی یہ رسول لوگوں پر اللہ کی طرف سے حجت ہیں نہ کہ ان رسولوں کی بعثت کے بعد لوگوں کی اللہ پر کوئی حجت ہے۔ اگر کہا جائے کہ زندہ امام ہی لوگوں پر حجت ہوتا ہے لہذا رسول اکرم ﷺ اس دنیا سے رحلت فرما جانے کے بعد (معاذ اللہ) حجت نہیں رہے تو سوچئے اس صورت میں حضرت امام باقرؒ اور حضرت امام جعفر صادقؒ وغیرہ بھی تو حجت نہ رہے کیونکہ یہ ائمہؑ بھی تو اس دنیا سے رحلت فرما چکے ہیں جبکہ مبینہ زندہ امام حضرت مہدیؑ غائب ہیں تو ثقلین سے تمسک کی صورت کیا ہوگی؟

(۳) اگر اصرار کیا جائے کہ معروضی حالات کے تحت ثقلین سے تمسک کی واحد صورت یہ ہے کہ حضرت امام جعفر صادقؒ کی جانب منسوب اقوال وافعال پر مبنی جو فقہ مرتب کی گئی ہے اس کی پیروی کی جائے تو امام جعفر صادقؒ کی جانب منسوب احادیث وروایات کو دوسروں تک منتقل کرنے والے اور ان راویات پر مبنی فقہ کو مرتب و مدوّن کرنے والے حضرات معصوم ہونگے یا غیر معصوم۔ اگر معصوم ہیں تو معصومین لاتعداد ہوں گے اگر غیر معصوم ہیں تو کیوں نہ اصحاب ائمہ کی بجائے اصحاب رسول اللہ ﷺ اور احادیث ائمہ کی بجائے احادیث رسول اللہ ﷺ کو اختیار کیا جائے؟ اور قرآن وحدیث پر مبنی فقہ مدوّن کرنے والے کسی بھی امام کو نہ تو معصوم سمجھا جائے اور نہ ہی اسے (معاذ اللہ) حجت اور شارع سمجھا جائے نہ ہی اسے منصوص من اللہ قرار دیا جائے۔ اگر کہا جائے کہ اصحاب رسول اللہ ﷺ کی عظیم اکثریت (معاذ اللہ) ناقابل اعتماد تھی تو اس مفروضے کی صورت میں دیگر بے شمار مفاسد کے علاوہ اللہ تعالیٰ پر یہ الزام بھی آتا ہے کہ اس نے افضل الرسل خاتم النبیین کو تو (معاذ اللہ) غیر معتبر ساتھی دیئے مگر بعد کے ائمہ کرامؒ کو مخلص اور قابلِ اعتماد ساتھی دیئے تو اس نے قرآن سید ھا ان ائمہ پر ہی کیوں نہ اتارا کہ ان ائمہ کے یہ مبینہ قابل اعتماد ساتھی قرآن کو اور ائمہؑ کی طرف سے اس کی قولی وفعلی تشریح وتبیین کو دوسروں تک صحیح صحیح منتقل کرتے اور امامیہ لٹریچر میں دو ہزار سے بھی زائد تحریف قرآن والی روایات نہ لانی پڑتیں؟ دنیا جانتی

ہے کہ اصحاب رسول نے اپنے دور کی ظالم و جابر دو عالمی طاقتوں روم وایران کو کچل کر رکھ دیا اور آدھی دنیا کو کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ پڑھا دیا۔ ادھر ائمہ کرامؒ اور انکے اصحاب کے متعلق ہمیں یہ روح فرسا خبریں سنائی جاتی ہیں کہ وہ مسلسل شدید خوف اور خطرے کی حالت میں رہتے ہوئے اکثر و بیشتر تقیہ اور کتمان سے کام لینے پر مجبور تھے اسی لئے ان کے اقوال وافعال میں زبردست اختلاف پایا جاتا ہے۔ اب ان متضاد اقوال وافعال پر غور کر کے یہ فیصلہ لازماً کرنا ہوگا کہ ان کا کون سا قول اور فعل تقیہ پر مبنی تھا اور کون سا تقیہ پر مبنی نہ تھا اس طرح کا فیصلہ کرنے والے لوگ معصوم ہونگے یا غیر معصوم اگر معصوم تھے تو ان کی تعداد معین نہ رہی اگر غیر معصوم تھے تو ان کے اس طرح کے فیصلوں میں خطا کا عقلا نہایت قوی احتمال ہے چنانچہ امامیہ عالم علامہ دلدار علی اساس الاصول میں تحریر فرماتے ہیں۔ **الاحادیث المأثورة من الائمه مختلفة جداً لایکاد یوجد حدیث الاوفی مقابلته ماینافیه، ولا یتفق خبر الا و بازائه مایضادّه، حتی صار ذالک سببا لرجوع بعض الناقصین عن اعتقاد الحق کما صرح به شیخ الطائفة فی اوائل التهذیب والا ستبصار، ومناشی هذا الاختلاف کثیرة جدا من التقیّة والوضع واشتباه السامع و النسخ والتخصیص والتقیید وغیره هذه المذکورات من الامور الکثیرة فی الاخبار المأثورة منهم و امتیاز الناشی بعضها عن بعض فی باب کل حدیثین مختلفین بحیث یحصل العلم والیقین بتعیین المنشأ عسیر جدا و فوق الطاقة کما لایخفیٰ** (۸۴) ''ائمہ سے منقول احادیث میں شدید اختلاف ہے کوئی حدیث ایسی نہیں کہ اس کے مقابلے میں اس کی نفی کرنے والی دوسری کوئی حدیث نہ ہو اور کوئی خبر ایسی نہیں ملتی کہ اس کے بالمقابل اس کی متضاد خبر نہ ہو یہاں تک کہ یہ صورت حال بہت سے ناقص لوگوں کے (بقول علامہ دلدار علی) اس سچے مسلک سے پھر جانے کا سبب بن گئی جیسا کہ اس کی تصریح شیخ الطائفہ نے کتب تہذیب اور استبصار میں کی ہے۔ اور اس اختلاف کے اسباب بھی بے شمار ہیں مثلاً ائمہ کا تقیہ، ائمہ پر لوگوں کا جھوٹ بولنا، سننے والے کو شبہ لاحق ہونا، نسخ، کسی حکم کا مخصوص ہونا اور مقید ہونا وغیرہ لاتعداد اسباب ائمہ سے منقول ان روایات میں پائے جاتے ہیں۔ دو مختلف حدیثوں کے بارے میں اختلاف کا سبب اس طرح معلوم کر لینا کہ علم اور یقین حاصل ہو جائے نہایت ہی دشوار ہے بلکہ انسانی طاقت سے ماورا ہے جیسا کہ مخفی نہیں ہے''۔ غور کیجئے اس صورت میں ثقلین سے مطلوبہ صحیح تمسک اور ان کی پیروی کیسے ممکن ہے؟۔ امامیہ لٹریچر میں تقیہ پر وافر مگر حوصلہ شکن اور پریشان کن مواد ملتا ہے۔ یہاں ایسی صرف دو

روایات پیش خدمت ہیں۔

عن ابی عبد اللہ علیہ السلام ،قال جاء رجل فلمّا نظر الیہ قال انا واللہ لاضلنّہ واللہ لاوھمنہ فجلس الرجل فسئلہ مسئلۃ فافتاہ فلما خرج قال لقدا فتیتُہ بالضلالۃ التی لاھدایۃ فیھا (۸۵) یعنی امام جعفر صادقؒ سے روایت ہے، راوی کہتا ہے کہ ایک آدمی آپ کے پاس آیا۔ آپ نے جب اسے دیکھا تو فرمایا اللہ کی قسم! میں اسے ضرور بالضرور گمراہ کروں گا۔ اللہ کی قسم! میں اسے ضرور بالضرور وہم میں ڈالوں گا۔ تو وہ آدمی آپ کی مجلس میں آ کر بیٹھ گیا اور اس نے آپ سے ایک مسئلہ پوچھا تو آپ نے اسے اس کا جواب دیا پھر جب وہ چلا گیا تو آپ نے فرمایا میں نے اسے ایسا فتویٰ دیا ہے جس میں گمراہی ہے ہدایت نہیں''

عن ابی عبد اللہ قال انی اتکلم علی سبعین وجھالی فی کلھا المخرج وایضاً عن ابی بصیر قال سمعت ابا عبدٰ اللہ یقول انی اتکلم بالکلمۃ الواحدۃ لھا سبعون وجھا ان شئت اخذتُ کذا وان شئتُ اخذت کذا (۸۶) ''حضرت امام جعفر صادقؒ سے روایت ہے آپ نے فرمایا کہ میں جب کلام کرتا ہوں تو اس میں ستر پہلو ہوتے ہیں اور میرے لئے ان میں سے ہر ایک میں نکلنے کا راستہ ہوتا ہے نیز ابو بصیر سے روایت ہے کہ میں نے امام جعفر صادقؒ کو یہ فرماتے سنا کہ جب میں ایک بات کرتا ہوں تو اس کے ستر پہلو یعنی معنیٰ ہو سکتے ہیں چاہوں تو میں یہ اختیار کرلوں اور چاہوں تو یہ اختیار کرلوں''۔ غور کیجئے یہ کیسے پتہ چلے گا کہ امام نے کسے گمراہ کیا اور کسے ہدایت فرمائی؟ اگر امام خود وضاحت کرے تو اس کے کلام میں ستر احتمالات ہیں۔ اس نام نہاد وضاحت سے ابہام اور اشتباہ ہرگز دور نہیں ہوسکتا۔ اگر یہ وضاحت کوئی غیر معصوم کرے تو اس میں خطا کا احتمال ہے لہذا اس کا بھی کوئی اعتبار نہیں۔ اگر ان (جھوٹی) روایتوں کو قبول کرلیا جائے تو ایسے ائمہ سے مطلوبہ تمسک کیسے ممکن ہے؟۔ خود ان اصحاب ائمہ کی روایات اور ان پر مبنی کسی فقہ کا کیا اعتبار رہا؟ صرف نام کی نسبت سے حقائق نہیں بدل جایا کرتے مثلاً عیسائی اپنی نسبت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف کرتے ہوئے بڑے فخر سے عیسائی کہلاتے ہیں لیکن دل لگتی کہئے کہ تثلیث اور کفارے وغیرہ کے مشرکانہ عقائد کی تعلیم (معاذ اللہ) واقعی حضرت عیسیٰؑ نے دی تھی؟۔ کہا جاتا ہے کہ ائمہ کرام حقِ حفاظتِ خود اختیاری کے تحت از راہ تقیہ مختلف لوگوں کو ایک ہی مسئلے میں مختلف اور متضاد فتوے دیا کرتے تھے اور از راہ تقیہ اپنے ساتھیوں کو سخت سست بلکہ (معاذ اللہ) ملعون تک کہنے سے پرہیز نہیں کرتے تھے تاکہ ائمہ اور اصحاب ائمہ کی جان اور عزت مخالفوں سے

محفوظ رہے۔ جیسے حضرت خضر علیہ السلام نے مسکینوں کی کشتی توڑ دی تھی تا کہ اس عیب دار کشتی کو کشتیاں چھیننے والا ظالم بادشاہ نہ چھینے۔ مقصود اس سے مساکین کے مال کی حفاظت ہی تھی لیکن یہاں قابلِ غور بات یہ ہے کہ یہ مساکین ہرگز اس کے مکلف اور پابند نہ تھے کہ حضرت خضرؑ کی احادیث وروایات کو دوسروں تک پہنچائیں۔ حضرت خضرؑ نے کشتی کو عیب دار کیا تھا مساکین کو تو (معاذ اللہ) ملعون قرار نہیں دیا تھا۔ اگر ان مفروضات کو صحیح سمجھ لیا جائے تو بے شک ائمہ اور اصحاب ائمہ کی جان تو بچ گئی ہوگی یہ کوڑے کھانے والے بیچارے تقیہ کی اس نعمت سے محروم حضرت امام احمد بن حنبلؒ اور حضرت امام مالکؒ وغیرہ تھے سولی پر لٹکائے جانے والے حضرت امام زید شہیدؒ تھے قید خانے میں اذیت اٹھانے والے ابوحنیفہؒ تھے البتہ یہ سوال اپنی جگہ پر قائم رہے گا کہ از راہ تقیہ جان بچانے کی خاطر متضاد اور متخالف باتیں کرنے سے دین تو سخت مشتبہ ہوگیا جیسا کہ علامہ دلدار علی کا اعتراف ہے کہ ان اختلافات کا صحیح سبب پالینا انسانی طاقت سے باہر ہے۔ اندریں صورت ائمہ کرام سے تمسک کیسے ہوگا! تمسک کا دعویٰ کیسے درست ہوگا؟

(۴) حضرت امام باقرؒ اور حضرت امام جعفر صادقؒ وغیرہ ائمہ کرامؒ کے اصحاب میں اگر کسی دینی مسئلے میں شدید اختلاف پیدا ہو جائے کہ نوبت شدید عداوت ونفرت اور ترک سلام وپیام تک پہنچ جائے تو کیا یہ اصحاب ائمہ اپنے ان تنازعات کا تصفیہ اپنے ائمہ کرامؒ سے کرانے کے پابند تھے یا نہیں تھے؟ اگر پابند نہیں تھے تو ائمہؒ کی موجودگی کا فائدہ کیا ہوا؟ نیز یہ کہنا کیسے صحیح ہوگا کہ یہ اصحاب ائمہ اپنے ائمہؒ سے تمسک فرمایا کرتے تھے؟ جب ان کا یہ حال ہو تو ان راویوں کی روایات پر مبنی فقہ پر عمل کرنے سے یہ کیسے ثابت ہوگیا کہ ثقلین سے تمسک کیا جارہا ہے؟۔ اگر کہا جائے کہ یہ اصحاب ائمہؒ اپنے جھگڑوں اور اختلافات میں ائمہ کرام سے رجوع کرنے کے پابند تھے تو بدقسمتی سے خود ہمارے امامیہ بھائی اس شق کو تسلیم نہیں کرتے چنانچہ علامہ دلدار علی اساس الاصول میں فرماتے ہیں۔ **لا نسلم انه كانوا مكلفين بتحصيل القطع واليقين كما يظهر من سجية اصحاب الائمه بل انهم كانوا مامورين باخذ الاحكام من الثقاة ومن غير هم ايضاً مع قيام قرينة** (۸۷) ''ہم نہیں مانتے کہ وہ (اصحاب ائمہؒ) یقین قطعی حاصل کرنے کے پابند تھے بلکہ انہیں یہ حکم تھا کہ دینی احکام معتبر اور غیر معتبر ہر طرح کے لوگوں سے حاصل کرو جس سے ظن (گمان غالب) حاصل ہو جائے''۔ اس کے بعد علامہ موصوف نے متعدد مثالیں پیش فرمائی ہیں جن میں ایک مثال ابن ابی عمیر اور ہشام بن حکم کے شدید اختلافات اور باہم قطع تعلق کی بیان کی ہے حالانکہ یہ لوگ امام صادقؒ، امام کاظمؒ اور امام رضاؒ تین تین ائمہ کے زمانوں کو پانے والے ہیں لیکن بقول علامہ موصوف انہوں نے اپنے

جھگڑوں کا صحیح اور یقینی فیصلہ کرانے کے لئے اپنے ائمہ سے رجوع نہیں کیا حالانکہ وہ ایسا کر سکتے تھے۔ جب یہ لوگ ان ائمہ کرام کی موجودگی میں معتبر اور غیر معتبر ہر طرح کے لوگوں سے دینی احکام سیکھنے کے مامور تھے تو یہ امر اور یہ اجازت انہیں ان ائمہ نے ہی دی ہوگی تو ان ائمہ کے موجود ہونے کا مقصد کیا تھا؟ اگر یہ لوگ اپنی مرضی سے معتبر اور غیر معتبر لوگوں سے احکام حاصل کرتے تھے تو کیسے کہا جا سکتا ہے کہ وہ ان ائمہ سے تمسک کرتے تھے؟۔ دین کے فروع تو ایک طرف رہے، ان اصحاب ائمہ نے تو اصول دین کو بھی ائمہ کرام سے حاصل نہیں کیا چنانچہ امامیہ عالم شیخ مرتضیٰ فرائد الاصول میں تحریر فرماتے ہیں۔ ثم ان ماذکرہ من تمکن اصحاب الائمہ من اخذ الاصول والفروع بطریق الیقین دعوی ممنوعة واضحة المنع واقل مایشهد علیها ماعلم بالعین والاثر من اختلاف اصحابهم صلوات الله علیهم فی الاصول والفروع (۸۸) ''اس (شخص) نے جو یہ ذکر کیا ہے کہ اصحاب ائمہ کو دین کے اصول وفروع میں یقین حاصل کرنے پر قدرت تھی تو یہ ناقابل قبول دعویٰ ہے جس کا ناقابل قبول نہ ہونا بالکل کھلا اور واضح ہے اور اس کا کم سے کم ثبوت تو ان اختلافات سے مل جاتا ہے جو ائمہ صلوات اللہ علیہم کے اصحاب میں دین کے اصول وفروع میں موجود تھے یہ ایسی حقیقت ہے جو آنکھوں سے دیکھی گئی اور آثار ائمہ سے پہچانی گئی ہے''۔

اس کے بعد علامہ موصوف نے ان اختلافات کے اسباب خود ائمہ کی زبانی بیان فرمائے ہیں جن میں بہت بڑا سبب تقیہ ہے اور دوسرا بڑا سبب یہ ہے کہ لوگوں نے ان ائمہ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگی ہی میں ان پر جھوٹ باندھنا شروع کر دیا تھا۔ مذکورہ صورت حال کے پیش نظر ثقلین سے تمسک والی بات کہاں رہی؟ کیا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں بھی ایسی کوئی مثال ملتی ہے کہ انہیں یہ حکم دیا گیا ہو کہ دینی مسائل معتبر اور غیر معتبر ہر طرح کے لوگوں سے سیکھ لیا کرو جس سے ان مسائل کے صحیح ہونے کا بس گمان غالب (ظن) حاصل ہو جائے جبکہ رسول اکرم ﷺ تک ان کی رسائی بھی ممکن ہو۔ اور یہ کہ اپنے باہمی جھگڑوں میں سلام وکلام تک بھی ترک ہو جائے تو مجھ سے تصفیہ نہ کراؤ؟ کیا رسول اکرم ﷺ کی حیات طیبہ میں کبھی ایسا ہوا کہ ایسی صورت حال میں آپ نے اصحاب کی اصلاح وتربیت نہ فرمائی ہو؟۔

(۵) اہل علم سے یہ امر مخفی نہیں کہ اصول کافی وغیرہ امامیہ کتب میں تصریح ہے کہ ائمہ کرام کو تحلیل وتحریم یعنی کسی بھی چیز کو حلال وحرام ٹھہرانے کے مکمل اختیارات تھے۔ اب اگر امام ان اختیارات کے تحت قرآن میں مذکور کسی حلال کو حرام اور حرام کو حلال قرار دے تو امام اور قرآن دونوں باہم مختلف ہونگے۔ اس صورت میں حدیث ثقلین کا یہ مفہوم کہ قرآن اور اہل بیت قیامت تک جدا نہیں ہونگے، ان

ائمہؒ پر کیسے چسپاں ہوگا؟ اگر کہا جائے کہ ائمہ کرام کو تحلیل وتحریم کے یہ اختیارات خود قرآن کریم نے دیئے ہیں تو یہ مفروضہ اختیارات تو ایک طرف رہے، قرآن کریم میں عقیدۂ امامت اور ائمہ کرام کی نام بنام تعیین کا اشارہ تک موجود نہیں ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو شارع بطور اسناد مجازی کہا جاتا ہے کہ آپ دین کے اصول فروع بذریعہ وحی اللہ تعالیٰ سے حاصل کر کے لوگوں تک پہنچاتے ہیں۔ حقیقی شارع صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے اگر آپ کو بذاتِ خود تحلیل وتحریم کا اختیار ہوتا تو قرآن کریم میں آپ کو مخاطب کرتے ہوئے یہ نہ کہا جاتا۔ یٰٓاَیُّھَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰہُ لَکَ (۸۹) یعنی اے نبی! تو اس چیز کو اپنے اوپر کیوں حرام کرتا ہے جو اللہ نے تیرے لئے حلال کی ہیں۔ اگر کہا جائے کہ ائمہ کرام پر بھی وحی نازل ہوتی ہے اور وہ بذریعہ وحی حلال وحرام کی تفصیل بتاتے ہیں، تو ان ائمہ کرام کو (معاذ اللہ) نبی قرار دینا ہوگا گو زبان سے اقرار نہ کیا جائے اور یہاں تو یہ حال ہے کہ ان ائمہ کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا باقی تمام حضرات انبیاء علیہم السلام سے بھی افضل قرار دیا جاتا ہے تو غور کیجئے کہ عقیدۂ ختم نبوت پر ایمان کیسے باقی رہا؟۔ عیسائی حضرات بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو تو زبان سے خدا اور خدائی اختیارات کی حامل ہستی قرار دیتے ہیں مگر وہ اپنے کسی پوپ، راہب اور عالم کو زبان سے خدا نہیں کہتے اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ان لوگوں نے اپنے احبار ورہبان اور عیسیٰ بن مریم کو اللہ کے سوا رب بنالیا (۹۰) پس ثابت ہوا کہ عملاً کسی کو رب بنانے کے بعد زبان سے اسے رب نہ بھی کہا جائے تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا بعینہٖ اسی طرح کسی امام کو عملاً رسول اور نبی بلکہ اس سے بھی بڑھ کر قرار دیا جائے تو زبان سے اسے نبی یا رسول کہا جائے یا نہ کہا جائے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا اور عقیدۂ ختم نبوت کی بہر حال نفی ہو جاتی ہے۔

(۶) حدیث ثقلین میں جن اہل بیت سے تمسک کی ہدایت کی گئی ہے تو کیا اہل بیت کا اطلاق رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ساری اولاد پر ہے یا بعض پر؟ پہلی شق کو ہمارے امامیہ بھائی نہیں مانتے اگر بعض اولاد مراد ہے تو بارہ ائمہ کی تخصیص پر کونسی قطعی ویقینی دلیل موجود ہے؟ پھر یہ تخصیص بھی نام بنام ہے۔ غور کیا جائے تو یہ تخصیص قرآن کریم کے سراسر خلاف ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کی دیگر ادعیہ کے علاوہ یہ دعا بھی ہے۔ رَبَّنَا ھَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّیَاتِنَا قُرَّۃَ اَعْیُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِیْنَ اِمَامًا (۹۱) ''اے ہمارے رب! ہماری بیویوں اور اولادوں سے ہمارے لئے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما اور ہمیں پرہیزگاروں کا امام بنادے''۔ اب اس دعا کے قبول ہونے پر جو لوگ بھی امام المتقین بنیں گے وہ یا تو معصوم ہوں گے اور یا غیر معصوم ہونگے۔ اگر معصوم ہونگے تو یہ بے شمار اور لاتعداد ہونگے اور ان کا عصر

رسول سے ہونا بھی ضروری نہ ہوگا کیونکہ دعا کا مضمون عام ہے مسلمانوں میں سے کسی خاص فرد، قوم، گروہ، نسل اور رنگ سے مخصوص نہیں ہے۔ اگر وہ غیر معصوم ہونگے اور کسی بھی نسل یا گروہ سے ہونگے تو ثابت ہوا کہ دینی رہنماؤں کا معصوم ہونا اور عترتِ رسول سے ہونا ضروری نہیں نیز ہر حال میں ان کی اطاعت بھی واجب نہیں کیونکہ یہ ائمہ دین صرف عالم ہونے کی حیثیت سے یا عالم ہونے کے ساتھ ساتھ کسی انتظامی منصب پر بھی فائز ہونے کی حیثیت ہے اولوالامر میں شامل ہونگے اور اولوالامر سے اختلافِ رائے کی گنجائش ہے جیسا کہ سورۂ نساء میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ اے ایمان والو! اللہ کی اور رسول کی اطاعت کرو اور اپنے میں سے اولوالامر (علما و حکام) کی اطاعت کرو اگر تمہارا کسی معاملے میں (ان اولوالامر سے) جھگڑا ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول (یعنی قرآن وسنت) کی طرف لوٹاؤ یہی بہتر ہے اور اسی کا انجام عمدہ ہے۔ (۹۲) اگر کہا جائے کہ مذکورہ دعا کی قبولیت صرف بارہ ائمہ کرام کے حصہ میں آئی ہے تو سب لوگوں کو اس دعا کا سکھانا بیکار ہوا جو عیب ہے اور اللہ کا کلام عیب سے پاک ہے۔ اگر کہا جائے کہ یہ دعا صرف بارہ ائمہ کرام کے لئے ہے دوسروں کے لئے نہیں تو اول تو یہ قول محتاج دلیل ہے دوسرے اس کھینچا تانی سے بھی ان کا معصوم عن الخطا ہونا پھر بھی ثابت نہ ہوگا کیونکہ ان ائمہ کرام کو اللہ قرار دیا جائے تو یہ کھلا شرک ہے اگر انہیں رسول کہا جائے تو ختم نبوت کا کھلا انکار ہے۔ اگر انہیں اولوالامر میں شامل کیا جائے تو آیت سے ثابت ہو چکا کہ اولوالامر سے اختلافِ رائے کی گنجائش ہے حالانکہ جو معصوم عن الخطاء ہو اس سے اختلاف نہیں کیا جاسکتا اگر یہ اختلاف لوگوں کا آپ ہی میں ہو تو بھی اسے دور کرنے کے لئے صرف اللہ اور رسول کی طرف رجوع کی تعلیم سے اولوالامر کا غیر معصوم ہونا پھر بھی ثابت ہو رہا ہے۔ پس ثابت ہوا کہ یہ تمام مفروضات باطل ہیں اور حدیث ثقلین سے جو مفہوم ہمارے بھائی اخذ کر رہے ہیں، صحیح نہیں ہے۔

(د) امامیہ عالم علامہ نوری طبرسی اپنی کتاب ''فصل الخطاب فی تحریف کتاب ربّ الارباب'' میں لکھتے ہیں ''لایخفیٰ ان ھذا الخبر وکثیرا من الاخبار الصحیحۃ صریحۃ فی نقص القرآن و تغیرہ وعندی ان الاخبار فی ھذا الباب متواترۃ معنی وطرح جمیعھا یُوجب رفع الاعتماد عن الاخبار رأساً بل ظنی ان الاخبار فی ھذا الباب لا تقصر عن اخبار الامامۃ فکیف یثبتونھا بالخبر (۹۳)'' یہ امر پوشیدہ نہیں کہ یہ حدیث اور کثیر تعداد میں (امامیہ) روایات جو صحیح ہیں تحریف قرآن پر صریح دلالت کرتی ہیں کہ قرآن میں کمی ہوئی، اس میں تغیر وتبدل ہوا۔ اور میرے نزدیک تحریف قرآن میں روایات معناً متواتر ہیں ان سب کو رد کر دینے سے لازم آئے گا کہ تمام

(امامیہ) روایات سے یکسر اعتماد اٹھ جائے اور میرا گمانِ غالب ہے کہ تحریفِ قرآن کی یہ روایات، امامت کی روایات سے تعداد میں کم نہیں ہیں (اگر میرے امامیہ بھائی ان روایاتِ تحریف کا انکار کریں) تو بھلا وہ ان روایات سے عقیدۂ امامت کو کیسے ثابت کریں گے؟''۔ علامہ موصوف اسی کتاب میں ایک اور مقام پر لکھتے ہیں۔ ان الاخبار. الدالة علی ذالک تزید علی الفی حدیث وادعیٰ استفاضتها جماعة کا لمفید والمحقق الداماد والعلامة المجلسی وغیر هم بل الشیخ ایضا صرحهافی التبیان بکثر تها بل ادعی تواترها جماعة یاتی ذکر هم (۹۴)

''یہ روایات جو اس (تحریف) پر دلالت کرتی ہیں وہ دو ہزار سے زائد ہیں اور علمائے امامیہ کی ایک جماعت نے ان کے مستفیض ہونے کا دعویٰ کیا ہے جیسا کہ شیخ مفید، محقق داماد اور علامہ مجلسی وغیرہ بلکہ شیخ ابوجعفر طوسی نے اپنی تفسیر التبیان میں اس کثرت کی تصریح کی ہے بلکہ تحریفِ قرآن کی ان روایات کے متواتر ہونے کا علما کی ایک جماعت نے دعویٰ کیا ہے جن کا ذکر آگے آئے گا''۔

قرآن کریم میں مبینہ تحریف کی جن روایات کا علامہ نوری طبرسی نے حوالہ دیا ہے اگر یہ روایات صحیح ہیں اور موجودہ قرآن واقعی (معاذ اللہ) محرّف ہے تو وہ قرآن کونسا اور کہاں ہے جس سے تمسک کا حکم حدیث ثقلین میں دیا گیا ہے؟ اگر کہا جائے کہ (معاذ اللہ) اسی محرف قرآن سے تمسک مطلوب ہے تو اس کے جن حصوں اور جن آیات میں تحریف ہوئی ہے ان کی تعیین کے بغیر سب آیات میں ہی تحریف کا احتمال رہے گا پس یہ مبینہ محرف حصے بھی عنداللہ مقبول ہیں یا غیر مقبول؟ اگر مقبول ہیں تو تحریف کا دعویٰ ہی غلط ہوا اگر غیر مقبول ہیں تو ان کی پیروی سے اللہ کے کلام کی دراصل خلاف ورزی ہوتی ہے نہ کہ اس سے تمسک ہوا۔ نیز اس صورت میں اللہ تعالیٰ پر الزام آئے گا کہ تحریف کا یہ جرم اور گناہ تو (معاذ اللہ) صحابہ کرامؓ نے کیا اور سزا خواہ مخواہ پوری امت کو دے ڈالی کہ وہ اصل قرآن کی تلاوت اور اس سے مطلوبہ تمسک کرنے سے ناحق محروم کر دی گئی اور کوئی در جن بھر ائمہ کرامؒ کو بھی اس (محرّف) قرآن کی اصلاح سے محروم کئے رکھا۔ اور کہا یہ جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ پر عدل واجب ہے، اس طرح کہ صفتِ عدل کو انہوں نے عقائد میں شامل کر رکھا ہے۔

اگر امامیہ لٹریچر میں قرآن کریم کی تحریف پر جن سینکڑوں بلکہ ہزاروں روایات کا حوالہ علامہ موصوف نے دیا ہے، یہ جھوٹی ہیں تو امامت، تقیہ، متعہ، بدا (اللہ کی خبروں میں تبدیلی) وغیرہ وغیرہ تمام عنوانات پر امامیہ روایتوں کا بھی یقیناً اعتبار اٹھ گیا چنانچہ علامہ موصوف یہی رونا تو روتے ہیں کہ اگر

میرے امامیہ بھائی روایاتِ تحریف کا انکار کرتے ہیں تو وہ روایات کے بل بوتے پر عقیدۂ امامت کو کیسے ثابت کرینگے؟ تو ان نام نہاد متواتر روایات پر یا ان پر مبنی کسی فقہ پر عمل کرنے سے ہرگز یہ دعویٰ درست ثابت نہ ہوگا کہ ثقلین سے تمسک کیا جارہا ہے۔ الغرض ایسا دعویٰ ہر دو صورتوں میں غلط ٹھہرتا ہے خواہ ان روایات کو سچا سمجھتے ہوئے قرآن کو محرّف یا انہیں جھوٹا سمجھتے ہوئے قرآن کو غیر محرّف قرار دیا جائے۔ یہاں اہل سنت (سوادِ اعظم) کی معدودے چند اختلافِ قرأت یا نسخ کی روایات سے الزامی جواب درست نہ ہوگا یہ روایات سینکڑوں یا ہزاروں کی تعداد میں نہیں ان میں سے کوئی روایت بھی ہرگز رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی نہیں ان کے سب راوی غیر معصوم ہیں جبکہ امامیہ روایاتِ تحریف بقول ہمارے بھائیوں کے ائمہ معصومین سے مروی ہیں۔ اگر اہل سنت کی ان معدودے چند اور بیشتر صورتوں میں ضعیف، موضوع اور غیر معتبر روایات سے واقعی تحریف ثابت ہوتی ہے تو انہیں دیوار پر دے مارنا ہوگا۔ نیز الزامی جواب تحقیقی جواب کا بدل نہیں ہوا کرتا۔

(۸) ہمارے امامیہ بھائیوں کی طرف سے اذان کے کلمات میں بھاری بھرکم اضافہ ہرگز ہرگز ائمہ کرام سے ثابت نہیں ہے بلکہ یہ ان ائمہ کرام کے طریقے کی کھلی کھلی خلاف ورزی ہے۔ جب ہمارے بھائی ابوالائمہ حضرت علیؓ و دیگر ائمہ کرامؒ کی اذان نہ سنبھال سکے تو باقی دین کیا سنبھالا ہوگا؟ جب دین میں ایک اضافہ یقیناً ثابت ہو جائے تو باقی دینی مسائل میں بھی یقیناً خودساختہ، خانہ ساز اور من گھڑت اضافوں کا احتمال عقلاً موجود ہے۔ پس ائمہ سے تمسک تو مخدوش ہوگیا۔ امامیہ فقہ میں نکاح کے لئے گواہوں کی موجودگی سرے سے ضروری ہی نہیں (۹۵) اب اگر کوئی جوڑا بدکاری کے جرم میں پکڑا جائے تو اس جوڑے پر شرعی حد ہرگز قائم نہیں کی جاسکتی کیونکہ مرد وعورت دونوں یہ کہہ دینگے کہ ہم نے نکاح کر رکھا ہے اور ہمارے ہاں نکاح کے لئے گواہوں کی کوئی شرط نہیں۔ یوں بدکاری کے متعلق قرآنی سزا (حدّ) کا نزول (معاذ اللہ) بیکار اور عبث ہوا، حالانکہ اللہ کا کلام ہر عیب سے پاک ہے پس قرآن سے بھی تمسک کا دعویٰ غلط ہوا۔ اس طرح کے سینکڑوں مسائل میں سے یہ دو مثالیں بطور نمونہ ہیں۔ ان حالات میں ثقلین سے تمسک کا دعویٰ کیسے قبول کرلیا جائے؟ یہاں یہ یاد رہے کہ ہم اپنے بھائیوں سے اذان کے سلسلے میں یہ مطالبہ نہیں کررہے کہ اسے رسول اکرم ﷺ سے ثابت کیا جائے بلکہ ائمہ کرامؒ ہی سے اسے ثابت کر دکھائیں لہٰذا تراویح کے حوالے سے یہ الزامی جواب درست نہ ہوگا کہ اسے ہر حال میں رسول اکرم سے ثابت کیا جائے کہ بیس رکعت تراویح رمضان میں مسلسل باجماعت ادا کی جانی چاہئیں کیونکہ

بموجب حدیث سنت رسول اور سنتِ خلفائے راشدینؓ دونوں سے تمسک مطلوب ہے اور حضرت عمرؓ کا تراویح کو بدعتِ حسنہ کہنا لغوی معنی کے اعتبار سے ہے ورنہ حضرت علیؓ اپنے دور خلافت میں اسے یقیناً بند کرادیتے۔ نیز یہ بھی یاد رہے کہ الزامی جواب تحقیقی جواب کی ضرورت کو ہرگز پورا نہیں کرتا۔

(۹) حدیث ثقلین میں لوگوں کو مخاطب کر کے ثقلین سے تمسک کا جو حکم دیا گیا ہے، کیا اس خطاب میں ائمہ کرامؒ بھی شامل ہونگے یا نہیں؟ اگر وہ بھی اس خطاب میں شامل ہیں تو وہ اپنے آپ کی اتباع اور اطاعت کیسے کریں گے؟ اگر شامل نہیں تو قرآن وسنت میں ان کے لئے علیحدہ حکم کی نشاندھی ہونی چاہئے۔ اگر کہا جائے کہ ائمہ کرام قرآن کریم سے جدا نہ ہونگے لہذا وہ اسی سے رہنمائی حاصل کریں گے اور لوگوں کو اسی کی دعوت دیں گے تو اس پر خود ہمارے امامیہ بھائیوں کے بعض اپنے مسلمات اور دیگر شواہد کی روشنی میں جو اعتراضات وارد ہوتے ہیں ان کا تذکرہ مذکورہ بالا مباحث میں ہو چکا ہے۔ نیز اگر یہی بارہ ائمہ کرام مفترض الطاعہ ہیں اور ان کی امامت کا تسلیم کرنا اس لئے فرض اور واجب ہے کہ وہ بقول ہمارے بھائیوں کے منصوص من اللہ ہیں تو تاریخی شواہد کی روشنی میں یہ ماننا پڑے گا کہ خود بنی ہاشم نے ہی اس حدیث کو اپنے عمل سے غیر مئوثر بنا کر رکھ دیا۔ مثلاً رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عم محترم حضرت عباسؓ اور چچازاد بھائی حضرت عقیل بن ابی طالب رضی اللہ عنہما نے اور خود سیدنا حضرت علیؓ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی بیعت فرمائی۔ حضرات حسنین رضی اللہ عنہما نے امیر معاویہؓ سے صلح کر کے امتِ مسلمہ پر ان کی امارت وخلافت کو تسلیم کیا اور بیعت فرمائی۔ حضرت علیؓ کے صاحبزادے محمد بن حنفیہ نے امام زین العابدینؒ کی امامت کو قبول نہیں کیا اور نہ ہی ان کی بیعت کی۔ امام حسنؓ کے صاحبزادے حضرت حسن مثنیٰؒ اور امام زین العابدینؒ نے باہم ایک دوسرے کی امامت کو قبول نہیں کیا۔ امام زین العابدینؒ کے صاحبزادے حضرت زید شہیدؒ نے اپنے بھائی امام باقرؒ اور اسی طرح امام باقرؒ نے امام زید شہیدؒ کی امامت کو قبول نہیں کیا۔ محمد بن عبداللہ محض بن حسن مثنیٰ اور امام جعفر صادقؒ نے باہم ایک دوسرے کی امامت کو تسلیم نہیں کیا، ابراہیم بن عبداللہ محضؒ اور امام جعفرؒ نے باہم ایک دوسرے کی امامت کو قبول نہیں کیا۔ اس کے برعکس (بقول امامیہ حضرت امام مہدی کو چھوڑ کر) باقی سب نے اپنے اپنے دور کے خلفا کی بیعت کی، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباسؓ کی اولاد بنوعباس نے تو اپنے دور خلافت میں مبینہ طور پر خوف و دہشت کی ایسی فضا پیدا کی کہ ہمارے بھائیوں کے بقول بارہویں امام حضرت مہدیؒ کو تو غار میں ایسا چھپنا پڑا کہ سیکڑوں برس گزر جانے کے باوجود وہ ابھی حالت غیبت میں ہیں۔ ان بنو ہاشم کی دیکھا دیکھی دوا

اعظم بھی ان ائمہ کرام کو منصوص من اللہ اور مفترض الطاعۃ نہیں سمجھتا۔ ان سب کے متعلق شرعی فتویٰ کیا ہے؟

(۱۰) سورۂ واقعہ میں ہے کہ بروز قیامت امت محمد یہ ﷺ تین گروہوں میں بٹ جائے گی۔ ایک حصہ ''سابقون'' پر مشتمل ہوگا یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے انتہائی قریب ہونگے اور جنت میں بلند مرتبہ و مدارج پر فائز ہونگے ان کے متعلق ارشاد ہے ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ ○ وَقَلِيْلٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ ○(۹۶) ''یعنی یہ لوگ امت کے ابتدائی حصے میں بہت بڑی جماعت پر مشتمل ہوں گے اور بعد کے لوگوں میں ان کی تعداد تھوڑی رہ جائیگی''۔ دوسرا گروہ اصحاب الیمین (دائیں جانب والوں) کا ہوگا یہ بھی جنتی گروہ ہے ان کے متعلق ارشاد ہے۔ ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ ○ وَثُلَّةٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ ○(۱/ ۹۷) یعنی یہ بہت بڑی جماعت پہلوں سے اور بہت بڑی جماعت پچھلوں میں سے ہوگی''۔ تیسرا گروہ اصحاب الشمال (بائیں جانب والوں) کا ہوگا۔ یہ جہنمی ہونگے۔ ان کی تعداد کا اہل جنت کی تعداد سے کوئی تقابل کیا ہی نہیں گیا ہے۔ اب جو اقلیتی فرقے شروع ہی سے اسلام کے نام پر امت مسلمہ کا انتہائی قلیل حصہ رہے ہیں وہ اصحاب الیمین میں تو شمار نہیں ہو سکتے اگر حسن ظن سے کام لیتے ہوئے انہیں سابقون میں شامل کیا جائے کہ یہ امت کے ابتدائی دور میں گو بڑی تعداد میں ہونگے مگر اب سکڑتے سکڑتے تھوڑے سے رہ گئے ہیں تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب سابقون اور اصحاب الیمین دونوں ہی جنتی ہیں تو ان میں باہم ہرگز اصولی اختلاف نہیں ہوسکتا محض فروعی نوعیت کا ہوسکتا ہے۔ پس سوادِ اعظم اہل السنۃ والجماعۃ سے ناحق اصولی اختلاف انہیں سابقون میں نہیں رہنے دے گا۔ تیسرا گروہ تو پھر اصحاب الشمال ہی کا رہ گیا اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس سے بچائے۔ یہاں اس آیت کا حوالہ بیکار ہوگا وَقَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ (۲/ ۹۷) ''یعنی میرے بندوں میں سے شکر گزار بندے تھوڑے ہوا کرتے ہیں'' کیونکہ یہاں اللہ تعالیٰ نے ''الشکور'' فرمایا ہے ''المسلمون یا المومنون'' نہیں فرمایا کہ میرے بندوں میں مسلمان یا مومن تھوڑے ہوا کرتے ہیں۔ اس آیت کا یہ مطلب بھی نہیں کہ جس مسلک کے ماننے والے تھوڑے ہوں وہ لازماً اللہ کا شکر گزار ہوگا ورنہ یہودیوں کو اللہ کے شکر گزار بندے قرار دینا ہوگا۔ یہاں اس طرح کے مضمون کی آیات کا حوالہ بھی بے معنی ہوگا کہ اکثر لوگ عقل نہیں رکھتے، اکثر لوگ سمجھ نہیں رکھتے، تو نے اگر زمین کے اکثر لوگوں کی بات مانی تو تجھے گمراہ کردیں گے وغیرہ۔ کیونکہ ان آیات میں ''لوگوں'' کی اکثریت کا ذکر ہے، مسلمانوں کی اکثریت کا نہیں پورے قرآن کریم میں اس طرح کا مضمون ہرگز ہرگز نہ ملے گا کہ اگر تو نے اکثر مسلمانوں یا اکثر مومنین کی پیروی کی تو وہ تجھے گمراہ کردیں گے۔ امت محمد یہ کا اجماع تو دین میں حجت ہے ہی، اس کی اکثریت بھی حق پر رہے گی۔ تو ہم یہاں اکثریت سے جہلا کی اکثریت مراد

نہیں لے رہے لیکن بحمد اللہ مجموعی حیثیت سے عوام الناس کی اکثریت بھی اہل سنت کے احناف شوافع، حنابلہ، مالکیہ، اہل علم فقہاء اور اسی طرح محدثین کرام اور اہل حق متکلمین اسلام اور سچے اولیائے عظام کو حق پر سمجھنے اور اعتقادی طور پر ان سے وابستہ رہنے کی وجہ سے امت کا سوادِ اعظم کہلاتی ہے۔ یہاں اس آیت کا حوالہ بھی بیکار ہوگا وَمَا یُؤْمِنُ اَکْثَرُ هُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ (۹۸) ''لوگوں میں سے اکثر لوگ اللہ پر ایمان تو رکھتے ہیں مگر ساتھ ہی مشرک ہیں'' کیونکہ یہاں ایمان سے اصطلاحی وشرعی ایمان مراد نہیں لیا جاسکتا ورنہ یہ بیہودہ بات بھی تسلیم کرنا ہوگی کہ ایمان شرعی اور شرک دونوں جمع ہو سکتے ہیں حالانکہ یہ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں اور اجتماع ضدین محال ہے۔ یہاں ایمان کا لغوی مفہوم مراد ہے کہ یوں تو اکثر لوگوں اللہ کو خالق، مالک، رازق اور رب سب کچھ مانتے ہیں لیکن اس عبادت میں اور اس کے سلسلہ تدبیر و انتظام میں مخلوق کو بھی شریک سمجھتے ہیں لہذا مشرک ہیں۔ یہاں کفار کی اکثریت کا حوالہ دینا بھی سودمند نہ ہوگا کیونکہ سورۂ واقعہ میں اللہ تعالیٰ نے اصحاب الشمال کے زیادہ یا کم ہونے کا کوئی بات نہیں کی ہے اور اگر کسی اور مقام پر کفار کی کثرت کا ذکر بھی ہے تو اس کا تقابل مومنین سے من حیث المجموع نہیں کیا گیا ہے۔ اگر اصحاب الیمین اور اصحاب الشمال کی تعداد میں امت محمدیہ کے ساتھ امم سابقہ کو بھی ملحوظ رکھا جائے تو بھی ہمارا استدلال متاثر نہیں ہوتا کیونکہ امت محمدیہ کی کثرت وسطوت امم سابقہ کے مومنین کی مجموعی تعداد کے مقابلے میں بھی بالاتفاق معروف ومسلم ہے۔ الغرض جب ثابت ہو چکا کہ امت محمدیہؐ کی خصوصیات میں سواد عظم (اہل سنت) کا حق پر ہونا شامل ہے تو ہمارے امامیہ بھائیوں کا حدیث ثقلین سے مخصوص زیر بحث مفہوم کشید کرنا صحیح نہیں۔ اس حدیث کے صحیح اور اہل سنت رضی اللہ عنہم کی افراط وتفریط سے پاک صحیح حدیث کا تذکرہ آئندہ سطور میں مناسب مقام پر ہوگا۔

(۱۱) اصول روایت کے تحت حدیث ثقلین پر حاصل بحث ہو چکی چونکہ ہمارے امامیہ بھائیوں نے اس حدیث کو بلحاظ سند متواتر قرار دینے پر ایڑی چوٹی کا زور لگایا ہے لہذا مناسب معلوم ہوا کہ اصول روایت کے تحت بھی اسے ضروری حد تک زیر بحث لایا جائے۔

حدیثِ ثقلین کی اسنادی حیثیت

مولانا محمد نافع نے اپنی کتاب ''حدیثِ ثقلین'' میں کوئی اڑتیس کتب میں سے اس حدیث کے کوئی باسٹھ حوالہ جات پیش فرمائے ہیں جن میں سے اکثر حوالہ جات کی مکمل سند انہیں نہیں ملی بعض روایات

بے سند ہیں تو بعض کی سند نامکمل ہے جن روایات کی مکمل سند ملی ہے ان کے راویوں پر انہوں نے سیر حاصل بحث فرمائی ہے جزاہ اللہ تعالیٰ فی الدارین۔ ہم کتاب کے متعلقہ مباحث کی تلخیص پیش کئے دیتے ہیں۔

(ا) کتب سنّی اسماء الرجال

تہذیب التہذیب، ابن حجر عسقلانی، تقریب التہذیب عسقلانی، میزان الاعتدال للذہبی، لسان المیزان عسقلانی، تاریخ بغداد للخطیب، تذکرۃ الحفاظ للذہبی، کتاب الجرح والتعدیل للرازی، قانون الموضوعات طاہر فتنی، بستان المحدثین شاہ عبدالعزیز دہلوی۔

(ب) کتب شیعہ اسماء الرجال

رجال کشی، جامع الرواۃ اردبیلی، منتھی المقال ابوعلی، رجال تفرشی، رجال نجاشی، رجال مامقانی، تحفۃ الاحباب شیخ عباس قمی، ملخص المقال فی تحقیق احوال الرجال، روضات الجنات، خوانساری، تنقیح المقال۔

(ج) حدیث ثقلین کی متعدد روایات کے درج ذیل راوی سنی وشیعہ کی کتب اسماء الرجال کی سب یا بعض کتب یا کم ازکم ایک کتاب کی روشنی میں رافضی اور شیعہ ہیں، لہذا ان سے مروی روایات سنی و شیعہ متنازعہ مسائل میں قبول نہیں کی جاسکتیں۔

ابوسعید (محمد بن السائب کلبی) جسے عطیہ عوفی دھوکے سے ابوسعید خدریؓ ظاہر کیا کرتا ہے۔ عطیہ عوفی کوفی، شریک بن عبداللہ، یحیٰ بن عبدالحمید، زید بن الحسن انماطی، معروف بن خربوذ محمد بن فضیل، صالح بن موسیٰ طلحی، علی بن ثابت، الحارث الاعور، احمد بن محمد بن سعید الکوفی المعروف بہ ابن عقدہ، عباد بن یعقوب، کثیر النواء، ہارون بن سعد، جریر بن عبدالحمید الضبی، محمد بن سلمہ بن کہیل حضرمی، ابوالظفر یوسف بن فرغلی (سبط ابن جوزی)۔

(د) درج ذیل راوی شیعہ اسماء الرجال کی سب یا بعض یا کسی نہ کسی ایک کتاب کے مطابق شیعہ ہیں۔ ابومحمد احمد بن محمد العاصمی، سلیم بن قیس الہلالی۔

(ھ) درج ذیل راوی سنی اسماء الرجال کی سب یا بعض یا کسی نہ کسی ایک کتاب کے مطابق شیعہ ہیں۔ عبداللہ بن احمد بن عامر جس نے امام علی رضاؑ کی طرف ایک جھوٹا نسخہ صحیفہ علی رضا منسوب کر رکھا ہے۔ علی بن المنذر۔ سعاد بن سلیمان۔ خلف بن سالم مخزمی۔ یونس بن ارقم۔ سلمہ بن کہیل حضرمی۔ محمد بن احمد بن حمدان۔ نوح بن قیس جزامی۔ عبدالرحمٰن بن صالح۔ محمد بن المظفر۔ عبداللہ بن داہر۔ عبداللہ بن عبدالقدوس۔

(و) سنی اسماء الرجال کی کتب کی روشنی میں کثیر بن عبداللہ۔ کثیر بن زید۔ یونس بن ارقم۔ عبد الملک الرقاشی۔ محمد بن محمد الباغندی ضعیف ہیں۔ احمد بن مشنی۔ یحییٰ بن معاذ۔ یزید بن کثیر۔ ابوبکر محمد بن الحسین بن مصلح۔ جناح بن نذیر۔ ابوجعفر محمد بن علی۔ ابراہیم بن اسحٰق زہری۔ ابوالفضل بن فضلویہ مفقود الحال ہیں۔ احمد بن الاجم القاضی کذاب ہے۔ محمد بن محمد الباغندی ضعیف اور مُدلّس ہے۔ مطلب بن عبد اللہ بن حطب بہت زیادہ ارسال اور تدلیس سے کام لیتا ہے اسکی سند مضطرب ہوتی ہے۔ سبط ابن جوزی مؤلف تذکرۃ الخواص شیعہ ہے چنانچہ اس کی کتاب تذکرۃ الخواص الائمہ میں ہے۔ **ومن شرط الامام ان یکون معصوماً لئلا یقع فی الخطا** (۹۹) ''امام کو معصوم ہونا چاہئے تاکہ وہ خطا میں مبتلا نہ ہو''۔

ابوعبداللہ محمد بن یوسف الگنجی مؤلف کفایت الطالب شیعہ ہے کیونکہ شیخ سلیمان بن ابراہیم قندوزی مؤلف ینابیع المودۃ نے اپنی کتاب ینابیع المودۃ میں اس کا شیعہ ہونا یوں بیان کیا ہے (**قال الشیخ الکنجی) ان المهدی ولد الحسن العسکری فهو حی موجود باق منذ غیبته الی الان** (۱۰۰) ''شیخ کنجی کا یہ قول ہے کہ مہدی حضرت حسن عسکریؒ کا بیٹا ہے اور وہ غائب ہونے کے بعد تا حال زندہ، موجود اور باقی ہے''۔ یہ سلیمان بن ابراہیم قندوزی مؤلف ینابیع المودۃ بھی پختہ شیعہ ہے اس نے ینابیع المودۃ میں لکھا ہے کہ بارہ عدد وصی مفترض الطاعۃ ہیں جن میں پہلے علی المرتضیٰؓ اور آخری محمد مہدیؒ ہیں۔ محمد مہدی امام حسن عسکریؒ کا بیٹا ہے (۱/۱۰۱)۔

ایک اخطب خوارزم فقہ حنفی کے مشہور عالم ہیں ایک اور اخطب خوارزمی ہے جو ابن تیمیہؒ اور شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کی تحقیق کے مطابق کذاب ہے اور زیدی شیعہ ہے۔ (۲/۱۰۱) الغرض مذکورہ بالا لوگوں کی روایتیں ناقابل اعتماد ہیں۔

(ز) روایت ثقلین کی اسناد میں سب سے زیادہ صحیح، متصل اور قابل وثوق سند صحیح مسلم کی ہے جس کا متن بھی صاف ہے اور اس پر لاتخل اشکالات وارد نہیں ہوتے اور نہ ہی یہ خلاف قرآن ہے۔ یہ روایت حضرت زیدؓ بن ارقم سے مروی ہے ابتدا میں وہ اپنی کبرسنی اور ضعف حافظہ کا عذر پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جو کچھ میں بیان کرسکوں اسے قبول کرو اور جو بیان نہ کرسکوں اس کی مجھے تکلیف مت دو۔ پھر فرماتے ہیں کہ ایک روز رسول اللہ ﷺ نے ہمارے درمیان غدیر خم میں جو مکے اور مدینے کے درمیان ہے، کھڑے ہوکر خطبہ دیا آپ نے اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان کی اور وعظ ونصیحت فرمائی پھر اس کے بعد فرمایا اے لوگو! میں بھی ایک انسان ہوں عن قریب اللہ کی جانب سے قاصد موت میرے ہاں پہنچے گا میں

قبول کرلوں گا اور میں تم میں ثقلین (دو بھاری چیزیں) چھوڑے دیتا ہوں۔ ان میں سے پہلی چیز اللہ کی کتاب ہے جس میں ہدایت اور نور ہے پس اللہ کی کتاب کو پکڑو اور اس کے ساتھ تمسک کرو۔ پس حضرت نے کتاب اللہ کے عمل پر برانگیختہ کیا اور اس کی رغبت دلائی۔ پھر اس کے بعد فرمایا اور میرے اہلِ بیت ہیں تم کو اپنے اہل بیت کے متعلق اللہ کی یاد دلاتا ہوں یہ جملہ آپ نے تین مرتبہ دھرایا۔ حصین نے حضرت زید سے پوچھا کہ اے زید! آپ کے اہل بیت کون ہیں کیا آپ کی ازواج اس میں داخل نہیں؟ حضرت زیدؓ نے جواب دیا کہ آپ کی ازواج اہل بیت میں داخل ہیں تاہم آپ کے اہل بیت وہ ہیں جن پر صدقہ حرام ہے وہ ال علیؓ، ال عقیلؓ، ال جعفرؓ اور ال عباسؓ ہیں''۔ (۳/۱۰۱)

یہاں درج ذیل نکات قابل غور ہیں۔

(۱) سورہ نساء میں ہے وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَاتَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَاتَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا (۱۰۲/۱) ''جو شخص ہدایت واضح ہو جانے کے بعد رسول کی مخالفت کرے اور مومنین کے راستے کو چھوڑ کر کوئی اور راہ لے تو ہم اس کا رخ ادھر ہی کر دیں گے جدھر وہ خود ہو چلا ہے اور ہم اسے جہنم میں داخل کریں گے اور وہ برا ٹھکانا ہے''۔ دیکھئے اس آیت میں رسول کی مخالفت پر جہنم کی وعید ہے پس رسول کی اطاعت اور اتباع مقصود ومطلوب ہے اور یہ اطاعت دراصل اللہ ہی کی اطاعت ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی (۱۰۳) لہذا قرآن وسنت پر عمل سے مراد اللہ اور رسول کی اطاعت ہے۔ لیکن ٹھہریئے آیت میں اللہ تعالیٰ نے جہنم کی وعید کو صرف مخالفتِ رسول کے ساتھ ہی مخصوص نہیں کیا بلکہ مومنین کے راستے کی عدم اتباع کو بھی اس کے ساتھ مقرون (شامل) کیا ہے۔ نزول آیت کے موقع پر مومنین صرف اور صرف اصحاب رسول ہی تو تھے۔ اگر کہا جائے کہ یہاں ''مومنین'' سے مراد صرف اہل بیت ہیں سب صحابہ کرامؓ مراد نہیں ہیں تو اللہ تعالیٰ پر الزام آئے گا کہ اس نے مومنین کے لفظ کی بجائے سیدھا غیر سبیل اھل البیت ہی کیوں نہ فرمایا تاکہ عقائد کے معاملے میں قطعاً کوئی ابہام، اشتباہ اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والا کوئی نزاع سرے سے نہ ہوتا۔ عقائد کے بارے میں کلام میں ایسا ابہام عیب ہے اور اللہ کا کلام عیب سے پاک ہے۔ پس یہاں سب صحابہ کرام مراد ہیں اگر کہا جائے کہ پھر مومنین کی بجائے ''اصحاب الرسول'' کے کلمات کیوں نہ لائے گئے تو جواب یہ ہے کہ کسی بھی دینی مسئلے میں صرف صحابہ کرامؓ کا اجماع ہی دین میں حجت نہیں بلکہ بعد کے ادوار کے مومنین کا اجماع بھی دین میں حجت ہے

لیکن یہ تو معلوم ہی ہے کہ نزول آیت کے موقع پر مومنین صرف اصحاب رسول ہی تھے جن کے راستے کی پیروی نہ کرنے پر وعید سنائی گئی ہے پس جو شخص اصحاب رسول کے راستے کو چھوڑ کر اتباع محمدی کا دعویٰ کرے گا وہ بموجب آیت باطل پر ہے چنانچہ حدیث نبوی میں فرقۂ ناجیہ کی نشانی یہ بتائی گئی ہے ما انا علیہ و اصحابی (۱۰۴) ''یہ لوگ اس راستے پر ہونگے جس پر میں اور میرے اصحاب ہیں'' تو جن روایات میں ''اصحاب'' کے الفاظ ہیں ان کا مضمون قرآن کریم سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہے۔ جن روایات میں اصحاب کی بجائے عترت اور اہل بیت کے الفاظ ہیں وہ بظاہر کتاب اللہ کے معارض نظر آرہی ہیں ایسی روایات کے طرق واسانید گو اکثر متکلم فیہ ہیں لیکن انہیں نظر انداز کر کے روایات کو صحیح بھی سمجھ لیا جائے تو کتاب اللہ سے ان کا حقیقی تعارض تو محال ہے کہ اللہ کچھ کہے اور اس کا رسول کچھ کہے لہذا یہ تعارض محض صُوری اور ظاہری ہے حقیقی نہیں۔ اسے آسانی سے دور کیا جاسکتا ہے تطبیق کی عام فہم صورت یہ ہے کہ اہل بیت اور صحابہ کرام کا راستہ ایک ہی ہے ان کے راستے ہرگز ایک دوسرے سے الگ الگ نہیں ہیں کہ ان کی اذانیں، نمازیں اور مسجدیں الگ تھلگ ہوں۔ ان میں دین کا ہرگز کوئی اصولی اختلاف نہیں تھا خود حضرت علیؓ نے اپنے ایک مراسلے میں اس امر کی وضاحت فرمائی تھی کہ اہل شام سے ان کا جھگڑا صرف دمِ عثمان (حضرت عثمان کی مظلومانہ شہادت) کے بارے میں ہوا ہے ورنہ دین کے اصول وفروع میں ہم اہل شام سے اور وہ ہم سے کسی زائد چیز کا مطالبہ نہیں کرتے ہمارا رب ہمارا رسول ایک ہی ہے اور ہماری دعوتِ اسلام بھی ایک ہے (۱۰۵) یہ جھگڑا سیاسی وانتظامی نوعیت کا ہے کسی دینی اختلاف کا مظہر نہیں ہے۔ بعد میں سیدنا حضرت حسنؓ نے امیر معاویہؓ سے صلح کر کے اسے بھی نظر انداز کر دیا۔ پس جو شخص اہلِ بیت سے عداوت رکھتے ہوئے یہ سمجھے کہ وہ اصحاب رسول کے راستے کی پیروی کر رہا ہے یا اصحابِ رسول سے عداوت رکھتے ہوئے یہ سمجھے کہ وہ اہل بیت سے محبت کر رہا ہے تو ایسا شخص حق پر نہیں ہے۔ تو بعض احادیث میں ''اصحاب'' کی بجائے اہل بیت کے الفاظ اس لئے لائے گئے کہ اہل باطل کی شناخت آسانی سے ہو سکے جنہوں نے اہل بیت کے بارے میں افراط وتفریط سے کام لیا ہے مثلاً خوارج نے تو حضرت علیؓ اور آل علیؓ کو (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) کافر قرار دیا۔ روافض نے اہل بیت سے محبت کا دعویٰ تو کیا لیکن ازواج رسول کو بزعم خویش اہل بیت سے خارج سمجھا بناتِ رسول حضرت رقیہ، حضرت ام کلثوم اور حضرت زینب رضی اللہ عنہن کا انکار کر دیا۔ سوائے بارہ ائمہ کرام کے اکثر اولاد فاطمہؓ کی تکذیب کی چنانچہ زیدیہ حضرت امام باقرؒ اور ان کی اولادِ امجاد کے منکر ہیں۔ اثنا عشریہ نے حضرت زید بن علی بن حسین اور ان کے فرزند یحییٰؒ

اور جعفر بن موسیٰؒ اور ابراہیم بن موسیٰؒ (جو بڑے فاضل علما اور اتقیاء میں سے ہیں) کا انکار کیا۔ حضرت امام حسن عسکریؒ کے برادر حقیقی حضرت جعفر بن علیؒ کو (معاذ اللہ) کذاب کہا۔ آل حسنؓ مثلاً حسن بن حسن مثنیٰ اور ان کے فرزند محمد (نفس زکیہؒ) وغیرہ وغیرہ کا انکار کیا۔ (۱۰۶)

اس کے برعکس سواد اعظم (اہل سنت) کے نزدیک سب صحابہ کرامؓ اور تمام اہل بیت انتہائی قابلِ احترام ہیں۔ وہ اہل بیت میں رسول اکرم ﷺ کی سب اولاد بنین و بنات، جملہ امہات المؤمنینؓ، حضرت علیؓ، حضرت جعفر طیار، حضرت عقیل بن ابی طالب، حضرت عباس رضی اللہ عنہم اور ان سب کی اولاد کو داخل سمجھتے ہیں۔ رسول اکرم ﷺ کے زمانے کے یہ اہل بیت صحابہ کرام میں داخل ہیں ان سے الگ نہیں۔ سواد اعظم کی کتب رجال مثلاً طبقات ابن سعد، تہذیب التہذیب، تذکرۃ الحفاظ للذہبی، اعلام الموقعین لابن قیم، تہذیب الاسماء للنووی وغیرہ میں ائمہ کرام حضرت امام زین العابدین، حضرت امام باقر، حضرت امام جعفر صادق رضوان اللہ علیہم کے علم وشرف کی بیحد مدح کی گئی ہے۔ امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ دونوں حضرت امام جعفر صادقؒ کے شاگرد ہیں۔ امام مالکؒ ربیعہؒ سے وہ عکرمہؒ سے وہ ابن عباسؓ سے اور وہ علی بن ابی طالبؓ سے روایت کرتے ہیں۔ امام شافعیؒ، امام مالکؒ کے شاگرد ہیں جن کا سلسلہ روایتِ اہلِ بیت تک پہنچتا ہے۔ محمد بن الحسن امام ابوحنیفہؒ کے اور امام احمد بن حنبلؒ، امام شافعیؒ کے شاگرد ہیں غرض یہ کہ ان ائمہ کرام نے ائمہ اہل بیت سے استفادہ کیا ہے۔ نیز امام ابوحنیفہ، امام باقرؒ سے روایت حدیث کرتے ہیں (۱۰۷) الغرض ان ائمہ اہل بیت کی روایات سوادِ اعظم کی کتب حدیث میں موجود ہیں اور یقیناً موجود ہیں اگر کم ہیں تو حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کی روایات بھی تو حضرت ابوہریرہؓ کے مقابلے میں بہت کم ہیں اس سے حضرت ابوہریرہؓ کا حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ سے افضل ہونا ثابت نہیں ہوتا اور نہ ہی اسے حضرت عمرؓ اور عثمانؓ سے دوری پر محمول کیا جاسکتا ہے ہاں اس بات میں شک نہیں کہ ان ائمہ اہل بیت کے گرد اس قدر منافقین اور دھوکے باز بھی جمع رہے کہ ان حضرات کی صحیح روایات اور تعلیمات بہت کم آگے پہنچیں بلکہ ان پر بے دریغ جھوٹ بولا گیا ہے بھلا کون عقل مند اسے تسلیم کرے گا کہ ان ائمہ نے قرآن کریم کو محرف قرار دیا تھا اور اس سلسلے میں سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں روایات واقعی انہی سے مروی ہیں۔ اس لحاظ سے یہ حضرات مظلوم ہیں اور انتہائی مظلوم کہ ان کے نام پر مذہب وضع کرلیا گیا۔ ان کے سچے اصحاب اور شاگرد ان کو منصوص من اللہ اور مامور من اللہ نہیں سمجھتے تھے۔ لوگ جس طرح امام مالکؒ، امام احمد بن حنبلؒ کے گرد طلب حدیث میں جمع ہوتے تھے اسی طرح وہ ان حضرات سے بھی روایت لیتے اور علمی

استفادہ کرتے تھے یہ سب ائمہ اہل بیت اعتقادی اعتبار سے سواد اعظم (اہل سنت) میں ہی شامل ہیں گو انہیں اہل سنت سے کاٹنے اور دور رکھنے یعنی ہائی جیک کرنے کی کوششیں ہوتی رہی ہیں۔ فقہ حنفی کے اکثر مسائل حضرت علیؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے اقوال وافعال پر مبنی ہیں۔ بعد میں ہر فقہی مکتب فکر کے مسائل میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ حسب ضرورت اضافہ ہوا جو غیر معصوم مجتہدین اور فقہاء کے قیاس واجتہاد پر مبنی ہے۔ ہماری بحث ان قابلِ اعتراض مسائل مثلاً تحریف قرآن، تقیہ، بداوغیرہ وغیرہ میں ہوتی ہے جنہیں حضرات ائمہ کرام کی طرف ناحق منسوب کیا جاتا ہے۔

(۲) قرآنی صراحت کے مطابق رسول اکرم ﷺ کے اصل اور حقیقی اہل بیت میں آپ کی ازواج شامل ہیں اس کی وضاحت انشاء اللہ آیت تطہیر کے ضمن میں ہوگی۔ نیک اولاد بھی تبعاً اہل بیت میں شامل ہوتی ہے چنانچہ جب حضرت نوح علیہ اسلام نے اپنے بیٹے کو اہل بیت میں سمجھتے ہوئے اس کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا کی تو آپ کو جواب دیا گیا۔ اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ (۱۰۸)'' وہ تیرے اہل بیت میں شامل نہیں کیونکہ اس کے عمل اچھے نہیں''۔ یہاں ایمان کی بجائے عمل کا حوالہ دے کر واضح کر دیا گیا کہ اولاد کا کافر ہونا تو ایک طرف رہا اگر وہ بدعمل اور فاسق وفاجر ہو تو بھی اہل بیت میں شامل نہ ہوگی۔ بعد کے زمانوں کی نیک اولاد بھی مجازاً اہل بیت میں شمار ہو سکتی ہے جیسے حقیقی سیّد تو حضرات حسنین رضی اللہ عنہما ہیں کیونکہ وہ سیدا شباب اہل الجنۃ (جنت کے جوانوں کے دوسردار) ہیں۔ دو میں تیسرا شامل نہیں ہوتا لہذا ان کی اولاد کو مجازاً سیّد کہا جاتا ہے قرآن کریم میں ہے کہ ہم نیک لوگوں کی (نیک) اولاد کو بھی ان کے ساتھ ملحق کر دیں گے۔ (۱۰۹) ال اور اہل بیت کے الفاظ کے مفہوم میں تو ''سیّد'' کے اصطلاحی مفہوم سے کہیں زیادہ وسعت ہے چنانچہ زیر بحث حدیث ثقلین میں ال علی، ال جعفر، ال عقیل اور ال عباس کو اہل بیت قرار دیا گیا ہے۔ لفظ ''ال'' میں تو توسعاً امت محمدیہ کے تمام صالح افراد شامل ہیں صرف اولاد ہی کی تخصیص نہیں چنانچہ قرآن کریم میں ''ال فرعون'' سے فرعون کے وہ تمام متعلقین مراد ہیں جو اس کے ہم مسلک تھے ورنہ وہ سارے کے سارے فراعنہ مصر کے پوتے پڑوتے ہی نہیں تھے۔ قرآنی نص کے مطابق ازواج مطہرات امہات المؤمنین مسلمانوں کی (روحانی) مائیں ہیں پس تمام مسلمان رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے روحانی بیٹے ہیں۔

(۳) جس طرح حدیث ''ما انا علیہ واصحابی'' کا یہ مطلب نہیں کہ اصحاب رسول ﷺ فرداً فرداً معصوم عن الخطا اور مفترض الطاعۃ ہیں اسی طرح عترت اور اہل بیت کے الفاظ سے ان کا فرداً فرداً معصوم ہونا،

منصوص من اللہ ہونا، اور مفترض الطاعۃ ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ چنانچہ حضرت زیدؓ بن ارقم سے مروی حدیث کا متن صاف بتا رہا ہے کہ اہل بیت سے دلی محبت رکھی جائے اور ان کا احترام کیا جائے۔ حدیث کا مفہوم بالکل بے غبار ہے اس سے کسی قسم کا کوئی لاینحل اشکال پیدا نہیں ہوتا اور نہ ہی اس کا کتاب اللہ سے کوئی تعارض اور ٹکراؤ ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جس کے دل میں جملہ اہلِ بیت کا احترام نہیں اسکا ایمان ہی کامل نہیں۔

(۴) حضرت زیدؓ بن ارقم سے ثقلین کے مضمون کی صحیح مسلم میں دو احادیث مروی ہیں۔ ایک حدیث میں انہوں نے اہلِ بیت میں ازواج النبی ﷺ کو شامل کیا ہے اور دوسری میں شامل نہیں کیا۔ حضرت زید بن ارقمؓ نے خود اپنے بڑھاپے اور ضعفِ حافظہ کا عذر پیش فرمایا ہے اسے ملحوظ رکھا جائے تو اشکال پیدا نہیں ہوتا۔ دوسری وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ امہات المؤمنینؓ تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہم عصر تھیں البتہ عترتِ رسول یعنی سچے اہل بیت میں شامل دیگر لوگ تو ہر دور میں رہیں گے جن سے بدسلوکی کا خدشہ بھی باقی رہے گا لہذا حضرت زیدؓ بن ارقم نے اسی پر زور دیا یہ نہیں کہ انہوں نے ازواج مطہرات کو مطلقاً اہل بیت سے خارج کر دیا ہو۔ حدیث کے مضمون سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے چنانچہ جب ان سے پوچھا گیا کہ ازواج رسول اہل بیت میں داخل ہیں یا نہیں تو انہوں نے فرمایا **لنسائه من اهل بيته ولكن اهل بيته من حُرم الصدقة بعده** آپ کی بیویاں آپ کے اہل بیت میں ہیں لیکن (یہاں میری مراد ازواج رسول نہیں بلکہ) وہ اہل بیت ہیں جن پر آپ کے بعد صدقہ حرام کر دیا گیا ہے۔ یہاں ''لکن'' اور ''بعدہ'' کے الفاظ توجہ کے لائق ہیں۔ حضرت زیدؓ بن ارقم کے وہم وگمان میں بھی نہ ہوگا کہ بعد میں کچھ لوگ ازواج رسول ﷺ سے بھی بدظنی رکھیں گے اس لئے ان کے پیش نظر صرف عترتِ رسول تھی۔

(۵) حدیث ثقلین کی سب سے زیادہ صحیح اور متصل سند صحیح مسلم ہی کی ہے باقی اسناد مجروح ہیں لہذا یہ خبر واحد ہے۔ مجروح اور ضعیف اسناد کی کثرت سے کوئی حدیث ''متواتر'' نہیں ہو جایا کرتی۔ اگر حضرت زیدؓ بن ارقم کی بظاہر باہم مُعارض ان دو احادیث کی بنا پر ازواج مطہرات کو اہل بیت سے خارج کرنے پر ناحق اصرار کیا جائے تو خبر واحد متروک ہوگی اور کتاب اللہ کو لیا جائے گا۔ حدیث سے اخذ کردہ اس غلط مفہوم کو اس لئے بھی متواتر قرار نہیں دیا جاسکتا کہ حدیث متواتر اور قرآن کریم دونوں سے یقین قطعی حاصل ہوتا ہے جبکہ الفاظ کی اپنے معنی پر دلالت بھی صاف اور یقینی ہو اور یقینی دلیل کا یقینی سے تعارض محال ہے۔

(ج) بحوالہ آیتِ مباہلہ

سورۂ آل عمران میں ہے۔ فَمَنْ حَآجَّکَ فِیْهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَکَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَکُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَکُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَکُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَی الْکٰذِبِیْنَ ○(۱۱۰) جب تمہارے پاس علم آچکا تو اس کے بعد بھی اگر تم سے کوئی (عیسائی) اس (عیسیٰ علیہ السلام) کے بارے میں جھگڑا کرے تو کہو کہ اچھا میدان میں آؤ ہم اپنے بیٹوں کو بلائیں تم اپنے بیٹوں کو ہم اپنی عورتوں کو بلائیں تم اپنی عورتوں کو، ہم اپنی جانوں کو بلائیں تم اپنی جانوں کو۔ اس کے بعد ہم سب مل کر اللہ کی بارگاہ میں گڑگڑائیں اور جھوٹوں پر اللہ کی لعنت کریں''۔

نجران کے عیسائیوں نے کہا تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بیٹے ہیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ تو حضرت آدم علیہ السلام کی طرح اللہ کے بندے تھے جو مخلوق ہو وہ خدا یا خدا کا بیٹا نہیں ہوسکتا سورہ ال عمران کی ابتدائی آیات اسی بارے میں نازل ہوئی ہیں جب معاملہ ذرا حد سے تجاوز کر گیا تو نصاریٰ کو مباہلہ (ایک دوسرے پر بددعا) کی دعوت دی گئی چنانچہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علیؓ، حضرت فاطمہؓ اور حضرات حسنینؓ کو لے کر میدان میں آگئے جب نصاریٰ نے دیکھا تو گھبرا گئے اور مباہلے سے راہ فرار اختیار کی۔ ہمارے امامیہ بھائیوں کا کہنا ہے کہ رسول اکرم کے ساتھ مذکورہ چاروں حضرات بھی معصوم تھے ورنہ آپ انہیں ساتھ نہ لے جاتے۔ آپ حضرت علیؓ کو اس لئے لائے تھے کہ وہ ''انفسنا'' میں داخل ہونے کی وجہ سے نفس رسول ہیں۔ حضرات حسنینؓ ''ابناء نا'' میں اور سیدۃ النساء حضرت فاطمہؓ ''نساءنا'' میں داخل ہیں چونکہ وہ اکیلی تھیں اسلئے دور حاضر کے امامیہ بھائیوں کے بقول رسول اکرم ﷺ کی ایک ہی صاحبزادی تھیں۔ چونکہ بقول ان حضرات کے حضرت علیؓ نفس رسول ہیں لہذا رسول اللہ ﷺ کے بعد وہی آپ کے خلیفہ بلافصل ہیں۔

تبصرہ

(۱) اگر ہمارے بھائیوں کی مذکورہ منطق کو تسلیم کرتے ہوئے حضرت علیؓ کو نفسِ رسول قرار دیا جائے۔ تو نفسِ رسول ہونا تو ایک طرف رہا، بہت سے لوگوں کو (معاذ اللہ) نفس باری تعالیٰ بھی ماننا ہوگا مثلاً سورۂ مزمل میں ہے۔ وَاَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا (۱۱۱) ''اللہ کو قرضِ حسنہ دو''۔ دیکھئے قرض حاصل کرنے والا تو کوئی مستحق انسان ہی ہوگا لیکن کہا یہ جارہا ہے کہ اللہ کو قرض دو پس یہ مقروض (معاذ

اللہ) نفسِ باری تعالیٰ ہوگیا اور یہ کہنے کا بہانہ مل گیا کہ سوائے الوہیت (معبود ہونے کے) یہ مقروض دیگر تمام صفات میں (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) اللہ کی طرح ہوگیا لہذا یہ مقروض دیگر سب انسانوں بلکہ سب پیغمبروں سے بھی (معاذ اللہ) افضل ہوگیا۔ سورۂ حشر میں ہے۔ فَاَتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ حَيْثُ لَمْ يَحْتَسِبُوْا (۱۱۲) ''ان (یہود بنونضیر) کے پاس اللہ ایسی جگہ سے آیا کہ انہیں گمان تک نہ تھا''۔ دیکھئے بنونضیر کا محاصرہ تو بظاہر رسول اکرم ﷺ اور آپ کے ساتھیوں نے کیا تھا لیکن کہا یہ جارہا ہے کہ اللہ ان کے پاس آیا تھا۔ لیجئے اس منطق کی رو سے یہ سب حضرات (معاذ اللہ) نفسِ باری تعالیٰ ہوگئے، سورۂ زخرف میں ہے۔ وَجَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْفُلْكِ وَالْاَنْعَامِ مَا تَرْكَبُوْنَ (۱۱۳) '' اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے کشتیاں اور مویشی بنائے جن پر تم سوار ہوتے ہو''۔ دیکھئے بحری جہاز اور کشتیاں تو بظاہر انسان بناتے ہیں خواہ وہ مُسلم ہوں یا غیر مسلم لیکن کہا یہ جارہا ہے کہ تمہارے لئے یہ جہاز اور کشتیاں اللہ نے بنائیں تو کشتیاں بنانے والے مومن ہوں یا کافر (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) سب کے سب نفسِ باری تعالیٰ ہوگئے۔

(۲) ہمارے بھائیوں کی اس منطق کی رو سے خلفائے ثلاثہ حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ، حضرت عثمانؓ کو بھی بطریقِ اولیٰ نفسِ رسول قرار دیا جاسکتا ہے۔ غزوہ خندق کے سلسلے میں امامیہ عالم علامہ ابوعلی طبرسی اپنی تفسیر مجمع البیان میں تحریر فرماتے ہیں۔ اما الاولیٰ فان اللہ عزوجل فتح علی بھا الیمن واما الثانیۃ فان اللہ عزوجل فتح علی بھا الشام و المغرب واما الثالثۃ فان اللہ عزوجل فتح علی بھا المشرق فاستبشر المسلمون (۱۱۴) یعنی (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پتھر پر تین ضربات لگائیں اور تینوں مرتبہ چمک ظاہر ہوئی تو آپ نے فرمایا کہ) میری پہلی ضرب پر اللہ نے مجھ پر یمن فتح کیا۔ دوسری ضرب پر شام اور مغرب مجھ پر فتح ہوئے اور تیسری ضرب پر مشرق۔ تو مسلمان اس پر خوش ہوئے''۔ یہی بات ایک اور امامیہ مفسر علامہ محمد حسین طباطبائی نے اپنی تفسیر المیزان فی تفسیر القرآن میں لکھی ہے (۱۱۵)۔ تفسیر منہج الصادقین میں ہے گفت اللہ اکبر مفاتیح شام بمن دادند..... وگفت اللہ اکبر مفاتیح یمن در دست من نہادند..... فرمود اللہ اکبر مفاتیح ممالیک فارس بقبضۂ اقتدار من دادند (۱۱۶)'' (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے) فرمایا اللہ اکبر ان لوگوں نے مجھے ملک شام کی چابیاں دے دی ہیں..... اور فرمایا اللہ اکبر میرے ہاتھ میں یمن کی چابیاں رکھ دی ہیں..... فرمایا اللہ اکبر میرے قبضہ اقتدار میں فارس کے ممالک کی چابیاں دے دی ہیں''۔ ملا یعقوب کلینی کی روضۂ کافی میں ہے۔ فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ لقد فتح علی فی ضربتی ھذہ کنوز کسریٰ

وقیصر (۱۱۷) ''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بے شک میری اس ضرب میں مجھ پر کسریٰ اور قیصر کے خزانے فتح ہوئے ہیں''۔ ملا باقر مجلسی حیات القلوب میں تحریر فرماتے ہیں۔ پس فرمود کہ در برقِ اول قصر ہائے یمن را دیدم وخدا آں را بمن داد و در دوم قصر ہائے شام را دیدم و خدا آں را بمن داد و در برق سوم قصر ہائے مدائن را دیدم و ملک شاہانِ عجم را بمن داد پس خدا فرستادہ کہ لیظھرہ علی الدین کلہ ولو کرہ المشرکون (۱۱۸) (رسول اللہ ﷺ نے) فرمایا کہ پہلی چمک میں میں نے یمن کے محلات دیکھے اور خدا نے وہ مجھے دیدئے۔ دوسری روشنی میں میں نے شام کے محلات دیکھے اور خدا نے وہ مجھے دیدیئے اور تیسری روشنی میں میں نے مدائن کے محلات دیکھے، تو عجم کے بادشاہوں کا ملک مجھے دے دیا پس خدا نے یہ آیت بھیجی ''تا کہ وہ دینِ اسلام کو تمام ادیان پر غالب کرے اگر چہ مشرکوں کو ناپسند ہو''۔

دیکھئے امامیہ علما کی مذکورہ عبارتوں میں یہ ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا تھا کہ قیصر روم اور کسرائے ایران وغیرہ کے علاقے مجھ پر میرے ہاتھ پر فتح ہونگے یہاں عربی میں ''علیَّ'' اور فارسی میں ''بمن'' کے الفاظ پر خوب غور کیا جائے۔ دنیا جانتی ہے کہ یمن، شام اور قیصر وکسریٰ کے دیگر علاقے رسول اکرم ﷺ کی رحلت کے بعد خلفائے ثلاثہ کے ہاتھوں مفتوح ہوئے لیکن رسول اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ ''مجھ پر'' مفتوح ہوئے۔ پس اصحابِ ثلاثہ امامیہ علما کی تحریروں کی روشنی میں نفسِ رسول ہو گئے۔ ذرا ٹھہریئے ان علاقوں کے فتح کرنے میں یہ خلفا بنفسِ نفیس شریک نہیں تھے بلکہ حقیقتاً یہ ان لوگوں کے ہاتھوں پر فتح ہوئے جنھوں نے قیصر وکسریٰ کی فوجوں کے خلاف عملاً جنگوں میں حصہ لیا پس یہ تمام شرکائے جہاد بھی نفسِ رسول ہو گئے کہ رسول اکرم ﷺ فرما رہے ہیں کہ یہ علاقے مجھ پر فتح ہوئے۔ پس اسی منطق کی رو سے یہ سب حضرات بھی خلفائے بلا فصل ہوئے۔

علامہ کلینی روضۂ کافی میں بیعت رضوان کے سلسلے میں تحریر فرماتے ہیں۔ وبایع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم المسلمین وضرب باحدیٰ یدیہ علی الاُخریٰ لعثمان (۱۱۹) ''رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں سے بیعت لی (چونکہ حضرت عثمانؓ مکہ میں تھے حدیبیہ کے مقام پر نہیں تھے تو) آپ نے اپنا ایک ہاتھ دوسرے ہاتھ پر حضرت عثمانؓ کی طرف سے (بیعت کے لئے) مارا''۔ دیکھئے یہاں آپ نے اپنے دستِ مبارک کو حضرت عثمانؓ کا ہاتھ قرار دیا پس حضرت عثمانؓ بھی نفس رسول ہو گئے۔ یہاں یہ بھی غور کیجئے کہ آیتِ مباہلہ میں ''انفسنا'' جمع ہے اور جمع سے بغیر کسی دلیل اور قرینے کے

واحد مراد لینا درست نہیں۔ پھر اس مباہلے کے لئے رسول اکرم ﷺ بذاتِ خود تشریف لے گئے تھے لہذا انفسنا میں صرف حضرت علیؓ کو داخل کر کے انہیں نفسِ رسول قرار دینے کا مذکورہ استدلال نسبتہً کمزور ہے جبکہ روم وایران کی فتوحات کے متعلق ضمیر واحد متکلم لائی گئی ہے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان فتوحات سے پہلے رحلت فرما چکے تھے۔ ان میں بذاتِ خود شریک نہ تھے اور بیعت رضوان کے موقع پر حضرت عثمانؓ بھی بذات خود موجود نہ تھے لہذا اگر ہمارے بھائیوں کے طرز استدلال کو درست تسلیم کیا جائے تو خلفائے ثلاثہ کا نفسِ رسول ہونا تو بطریق اولیٰ ثابت ہو جائے گا۔

(۳) اگر حضرت علیؓ کو نفسِ رسول قرار دیا جائے تو لازماً مجازی معنی لینا ہوگا کیونکہ آپ اگر حقیقتاً نفسِ رسول ہیں تو آپ کو رسول ماننا ہوگا اور حضرت فاطمہؓ کی حیثیت آپ کی زوجہ محترمہ کی نہیں بلکہ (معاذ اللہ) بیٹی کی ہو جائے گی۔ مجازی معنی مراد لیں تو ایسے معنی سے عقائد ثابت نہیں ہوا کرتے۔ پھر عربی لغت میں ''نفس'' چچازاد بھائی کو بھی کہتے ہیں تو نفسِ رسول کا معنی چچازاد بھائی بھی ہو سکتا ہے اس سے خلافت بلافصل کا کوئی تعلق نہیں۔

(۴) کیا مباہلے میں عیسائیوں کے باطل عقائد تثلیث، کفارہ، حضرت عیسیٰ کے ابن اللہ ہونے کی تردید اور توحید ورسالت محمدیہ ﷺ کا اثبات مقصود تھا یا حضرت علیؓ کی خلافت بلافصل کا اعلان مطلوب تھا؟ سورہ آل عمران کے متعلقہ مباحث کی روشنی میں پہلی شق ہی صحیح ہے لہذا دوسری شق یہاں خارج از بحث ہے۔

(۵) آیت مباہلہ میں ابناء نا، نساء نا اور انفسنا کے مفہوم میں جن افراد کو ہمارے بھائی شامل کرتے ہیں کیا ان کی یہ تخصیص اور تعیین کہ فلاں لفظ میں فلاں اور فلاں لفظ میں فلاں فلاں داخل ہیں، خود رسول اکرم ﷺ نے فرمائی ہے یا یہ غیر معصوم مفسرین کے اپنے اندازے ہیں؟ پہلی صورت میں ثبوت درکار ہے۔ دوسری شق اختیار کی جائے تو بھلا عقائد غیر معصوم لوگوں کے اندازوں اور ظنِ وتخمین سے بھی ثابت ہوا کرتے ہیں؟

(۶) اگر آیت میں لفظ ''انفسنا'' کے مفہوم سے رسول اکرم ﷺ کو خارج کر دیا جائے تو باقی چار حضرات کا مباہلے میں شریک ہونا ہی کافی تھا تو رسول اکرم ﷺ بن بلائے اس میں کیوں شریک ہوئے؟ اصل بات یہ ہے کہ یہ کہنا ہی غلط ہے کہ اپنے آپ کو دعوت دینے اور بلانے کا کوئی مطلب نہیں بنتا لہذا انفسنا میں صرف حضرت علیؓ شامل ہو سکتے ہیں۔ اور کوئی وجہ نہیں کہ حضرت علیؓ کو ابناء نا میں داخل نہ کیا

جائے کیونکہ جیسے نواسوں پر بیٹے کا اطلاق مجازاً ہوتا ہے اسی طرح داماد پر بھی ہوتا ہے۔ مباہلے میں حضرت فاطمہؓ کے علاوہ باقی بناتِ رسول ﷺ کے نہ آنے سے ان کے وجود کی نفی نہیں ہو جاتی جیسے ازواج رسول کے مباہلے میں نہ آنے سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ رسول اللہ ﷺ کی بیویاں تھی ہی نہیں۔ نیز باتفاق مفسرین ومؤرخین دیگر بناتِ رسول واقعہ مباہلہ سے پہلے ہی انتقال فرما چکی تھیں۔

(۷) مباہلے میں دوسرا فریق نجران کے عیسائیوں کا ہے۔ تو کیا ابناء نا، نساء نا اور انفسنا کے مفہوم میں ان عیسائیوں کے بھی خاص خاص افراد متعین ہیں یا یہ الفاظ اپنے عموم پر قائم ہیں؟۔ پہلی شق کے لئے ثبوت درکار ہے دوسری شق صحیح ہے تو کیوں نہ مسلمانوں کے لئے بھی ان الفاظ کو اپنے عموم پر رکھا جائے؟ چنانچہ تفسیر روح المعانی میں آیت مباہلہ کی تفسیر کے ضمن میں یہ روایت موجود ہے۔ اخرج ابن عساکر عن جعفر بن محمد ان ابیه فی هذه الآیة تعالوا ندع ابناء نا الآیة قال فجاء بابی بکر وولده وبعمر وولده و بعثمان و ولده و بعلی وولده (۱۲۰)'' ابن عساکر نے امام جعفر صادقؒ سے انہوں نے اپنے والد سے اس آیت مباہلہ کے متعلق روایت کیا ہے کہ آپ نے حضرت ابوبکرؓ کو بھی مع ان کی اولاد کے، حضرت عمرؓ کو بھی مع ان کی اولاد کے اور حضرت عثمانؓ کو بھی مع ان کی اولاد کے اور حضرت علیؓ کو بھی مع ان کی اولاد کے بلا لیا تھا''۔ یہی مضمون تفسیر الدر المنثور میں بھی ہے۔ تفسیر طبری میں آیت مباہلہ کی تفسیر میں پیش کی گئی بعض روایات میں حضرت علیؓ کو مباہلے میں شامل کرنے کا ذکر ہے اور بعض میں نہیں دراصل رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم چاروں حضرات سیدنا علی، سیدہ فاطمہؓ اور حضرات حسنین رضی اللہ عنہما کو بطور ہراول دستے کے اپنے ساتھ سب سے پہلے لے گئے۔ وہاں مباہلہ ہوا ہی نہیں اگر مباہلہ ہوتا تو یقیناً دوسرے حضرات بھی شریک مباہلہ ہوتے کیونکہ آیت میں ابناء نا، نساء نا اور انفسنا میں سب جمع کی ضمیریں ہیں۔

(۸) اگر آیت مباہلہ سے حضرت علیؓ اور حضرات حسنینؓ کی امامت وخلافت ثابت ہوتی ہے تو باقی نو ائمہ کی نام بنام امامت کیسے ثابت ہوگی؟ مباہلے میں سیدہ فاطمہؓ بھی شریک تھیں وہ عہدۂ امامت پر کیوں فائز نہیں؟ اگر آیت مباہلہ کی رو سے حضرت حسینؓ کی کچھ اولاد کے لئے امامت ثابت ہوتی ہے تو اولادِ حسنؓ اس سے کیوں محروم ہے؟

(۹) حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ہجرت مدینہ کے موقع پر رسول اکرم ﷺ کا بھرپور ساتھ کئی دنوں تک دیا۔ مالی ایثار سے بھی کام لیا مثلاً غار ثور میں خورد ونوش کا سامان حضرت ابوبکر صدیقؓ کے گھر

سے ہی آتا رہا۔ غارِ ثور میں لگاتار تین روز تک قیام رہا۔ ان تین دنوں میں رسول اکرم ﷺ کے ساتھ سوائے ابوبکر صدیق کے کوئی اور تھا ہی نہیں۔ ہجرت اور مہاجرین کے فضائل قرآن کریم میں جا بجا مذکور ہیں ہجرت سے اسلام اور مسلمانوں کو عظیم فوائد حاصل ہوئے۔ سب سے پہلا اور بڑا فائدہ یہ ہوا کہ مدینہ منورہ میں اسلامی ریاست وجود پذیر ہوئی۔ غارِ ثور میں رفاقتِ رسول پر حضرت ابوبکر صدیقؓ کو لسانِ رسالت سے ''ان اللہ معنا'' کی بشارت دی گئی کہ جو معیت الٰہیہ رسول اللہ ﷺ کو حاصل ہے اس میں سے حصہ ابوبکر صدیقؓ کو بھی ملا اور اس وصف میں کوئی اور صحابیؓ رسول آپ کا شریک نہیں ہے۔ ہجرت کا کام بخیر وخوبی پایۂ تکمیل تک پہنچا۔ اس کے برعکس سیدنا حضرت علیؓ نے رسول اکرم ﷺ کا ساتھ مباہلے میں اکیلے نہیں بلکہ دیگر حضرات کے ہمراہ دیا اور بعض روایات کے مطابق تو آپ شریکِ مباہلہ تھے ہی نہیں لیکن ہم انہیں نظر انداز کیے دیتے ہیں۔ مباہلے کی کوئی معمولی سے معمولی فضیلت بھی قرآن کریم میں مذکور نہیں۔ پھر یہ مباہلہ سرے سے ہوا ہی نہیں۔ مباہلے کے لئے حضرت علیؓ نے صرف ایک دن یا دن کے کچھ حصے کے لئے اکیلے نہیں بلکہ دوسروں کے ہمراہ رسول اکرم ﷺ کا ساتھ دیا۔ چونکہ مباہلہ ہوا ہی نہیں اس لئے اللہ تعالیٰ کی تکوینی حکمت کے تحت عیسائیت آج تک مسلمانوں کے لئے مسئلہ بنی ہوئی ہے۔ صلیبی جنگوں میں اور حال ہی میں کوسووو وغیرہ میں اور ماضی قریب وبعید میں مسلمان ممالک پر عیسائیوں کے جابرانہ تسلط اور مظالم کو کون بھول سکتا ہے؟ بایں ہمہ مباہلے میں شرکت کی وجہ سے حضرت علیؓ تو نفس رسول بھی ہو گئے اور خلیفہ بلافصل بھی۔ ادھر حضرت ابوبکر صدیقؓ کے متعلق سمجھا جا رہا ہے کہ نفسِ رسول اور خلیفہ بلافصل ہونا تو ایک طرف رہا انہیں تو (معاذ اللہ) ایمان بھی نصیب نہ ہوا۔ کیا یہ (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) اسی اللہ کا کرم ہے جس کے ذمہ بقول ہمارے بھائیوں کے عدل بھی واجب ہے؟

(۱۰) کہا جاتا ہے کہ امم سابقہ میں پیغمبر یا اللہ تعالیٰ لوگوں کے لئے حاکم منتخب فرماتا رہا ہے لہٰذا سنت اللہ نہیں بدل سکتی۔ اگر اسے درست تسلیم کرلیا جائے اور سنۃ اللہ میں عدم تغیر کا یہی مفہوم لیا جائے تو امم سابقہ میں نبوت کا سلسلہ جاری تھا۔ سنۃ اللہ کے مطابق اسے اب بھی جاری رہنا چاہئے تو رسول اکرم ﷺ پر نبوت کیوں ختم کردی گئی؟ یہاں یہ بھی یاد رہے کہ نظیر دلیل کا کام نہیں دیا کرتی ورنہ یہ کہنا بھی درست ہوگا کہ مثلاً موجودہ پاکستانی صدر کو ہم صدر اس لئے نہیں مانتے کہ ان سے پہلے اس نام کا پاکستان کا کوئی صدر نہیں گزرا ہے۔

(۱۱) جب قرآنی آیت کے ساتھ ظنی روایتوں کو ملایا جائے تو پورا مفہوم ظنی ہو جائے گا جو عقائد

کے لئے کارآمد نہیں قرآن کریم میں اگر ایک آیت ہی اس مضمون کی ہوتی کہ ہم نے حضرت علیؓ کو رسول اکرم ﷺ کے بعد خلیفۂ بلافصل مقرر کیا ہے تو ان تکلفات کی ضرورت ہی نہ رہتی۔ ظنی روایتوں کو کتاب اللہ سے ملحق کرکے تکلف اور تصنع سے کوئی عقیدہ ثابت کرنا ہی استدلال کے ضعف پر نمایاں دلیل ہے۔

(د) بحوالہ آیت مودۃ قربیٰ

قُل لَّآ اَسئلُکُمْ عَلَیْہِ اَجْرًا اِلَّا الْمَودَّۃَ فِی الْقُرْبیٰ (۱۲۱) اے پیغمبر! کہہ دیجئے کہ میں تم سے اپنے اس کام (تبلیغ دین) پر کوئی اجرت نہیں مانگتا مگر قرابت میں محبت (والے سلوک کی تم سے امید رکھتا ہوں)''۔

ہمارے امامیہ بھائیوں کا یہ کہنا ہے کہ آیت کے معنی یوں ہیں کہ ''اے لوگو! میں تم سے کوئی اجرت تبلیغ پر نہیں مانگتا مگر رشتہ داروں کی محبت''۔ اور ظاہر ہے کہ محبت کا صحیح مظاہرہ تب ہوگا جب حضرت علیؓ کو خلیفہ بلافصل تسلیم کرلیا جائے۔

تبصرہ

(۱) آیت میں لفظ ''قربیٰ'' بمعنی قرابت ورشتہ داری ہے نہ کہ ذی القربیٰ بمعنی رشتہ دار۔ اگر یہاں مفہوم رشتہ داروں ہی کا لیا جائے تو قرابت کی تین اقسام ہیں نسبی یعنی خونی رشتہ۔ رضاعی یعنی دودھ سے پیدا ہونے والا رشتہ، صہری یعنی نکاح سے پیدا ہونے والا سسرالی رشتہ۔ تو رسول اکرم ﷺ کے تمام نسبی، رضاعی اور صہری رشتہ داروں سے محبت مطلوب ہے۔ ایک یا چند افراد کی کسی صحیح خبر واحد سے بھی تعیین وتخصیص ہوتی تو بھی آیت کا مفہوم قطعی نہ رہتا بلکہ ظنی ہو جاتا۔ ظن عقائد میں کارآمد نہیں۔

(۲) محبت میں خلافت اور وہ بھی بلافصل کا مفہوم کیسے نکل آیا؟ قرآن کریم میں ہے۔ وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُھُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ (۱۲۲) ''مسلمان مرد اور عورتیں باہم ایک دوسرے کے دوست ہوتے ہیں''۔ تو کیا سب مومنین اور مومنات ایک دوسرے پر خلیفہ بلافصل ہو گئے؟۔ خلیفہ بلافصل ہونا تو ایک طرف رہا کسی جماعت یا گروہ سے محبت کا یہ مطلب لینا بھی درست نہیں کہ سب سے فرداً فرداً تعارف بھی ہو۔ اگر ہو بھی تو بھی خلافت بلافصل کا اس سے کوئی تعلق نہیں مثلاً والدین اولاد سے اور اولاد والدین سے محبت کرتی ہے اس محبت کا یہ مفہوم لینا کس قدر عجیب اور مضحکہ خیز ہوگا کہ والدین اور اولاد ایک دوسرے کے لئے خلفا بلافصل ہیں۔

(۳) اگر خلافت ہی مراد ہے تو کیا نزول آیت کے موقع پر یا بعد میں مراد ہے؟ پہلی شق خلاف عقل ونقل ہے۔ نزول آیت کے وقت مسلمانوں کے حاکم خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہی تھے۔ اگر دوسری شق صحیح ہے تو اس میں بلافصل کی قید کہاں سے آگئی؟

(۴) قرآن کریم میں جا بجا مذکور ہے کہ انبیا علیہم السلام اپنی اپنی قوم سے کہتے رہے ''میں تم سے تبلیغ پر کوئی اجرت نہیں مانگتا'' اور بعض نے یہ بھی کہا کہ میری اجرت تو محض اللہ کے ذمہ ہے (۱۲۳) خود رسول اکرم ﷺ کے متعلق بھی دوسرے موقع پر ارشاد ہے۔ قُل لَّا اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ اَجْرًا (۱۲۴/۱)'' تو کہہ دے کہ میں تم سے اس تبلیغ پر کوئی اجرت نہیں مانگتا۔ پس ثابت ہوا کہ زیر بحث آیت میں ''الا المودۃ فی القربیٰ'' استثناء منقطع ہے۔ آیت کا صاف مفہوم یہ ہے کہ جب میں تم سے تبلیغ پر کوئی اجرت نہیں مانگتا اور اس تبلیغ سے تمہاری خیر خواہی ہی مقصود ہے تو تم میرے پیغام کو قبول نہیں کرتے تو مجھے تکلیف تو نہ پہنچاؤ اور میرے راستے میں رکاوٹیں نہ ڈالو۔ رشتہ داری ہی کا لحاظ کرو کہ میں بھی قبیلۂ قریش کی شاخ بنی ہاشم سے ہوں اور قریش کی سب شاخیں اوپر جا کر ایک ہو جاتی ہیں اس لئے میں تمہارا ہم نسب ہوں۔ آیت کا یہ مضمون محض وعظ وتذکیر ہے یہ کوئی رحم کی درخواست نہیں ہے نہ ہی اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ کفار سے (معاذ اللہ) خوف زدہ تھے۔ یہ نصیحت اسباب عادیہ کے تحت ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ کو اللہ تعالیٰ پر (معاذ اللہ) بھروسہ نہیں تھا۔ جائز اسباب اختیار کرنا ہرگز خلاف توکل نہیں۔ آیت کے اس صاف اور بے غبار مفہوم پر یہ شبہ غلط ہے کہ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ میں تو تمہارے مذہب کی جڑیں کاٹتا ہوں لیکن تم میری رشتہ داری کا خیال کرو کیونکہ اگر قربیٰ سے رشتہ داری کی بجائے رشتہ داروں کا معنی بھی لیا جائے تو ایسا شبہ تو پھر بھی باقی رہے گا کہ میں تو تمہاری جڑیں کاٹتا ہوں لیکن تم میرے رشتے داروں سے برابر محبت کئے جاؤ۔ شرک وبت پرستی کی جڑیں کاٹ کر مشرکین کو توحید کی دعوت دینا سراسر ان کی خیر خواہی اور اصلاح ہے مثلاً حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم کے مخالفین ومعاندین سے فرمایا۔ (۲۴/۲) اِنْ اُرِیْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ وَمَا تَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللّٰہِ '' میں تو حتی المقدور محض اصلاح چاہتا ہوں اور اس کی توفیق مجھے صرف اللہ ہی سے حاصل ہو سکتی ہے''۔ پس مذکورہ طرز کے لغو شبہات کی قطعاً گنجائش نہیں۔ آیت میں قرابت کا لحاظ کرنے کا یہ مطلب بھی نہیں کہ میری تو رعایت کرو مگر میرے اقارب کو بے شک قتل کر ڈالو لہٰذا یہ شبہ بھی باطل ہے کہ آیت کا یہ مفہوم لینے سے رسول اکرم کا (معاذ اللہ) خود غرض ہونا ثابت ہوتا ہے کہ اپنا خیال تو کیا، اقارب کا نہ کیا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رعایت میں آپکے جملہ نسبی، رضاعی اور صہری رشتہ داروں کی رعایت

از خود شامل ہے جو کسی ذی فہم سے مخفی نہیں ہے۔

(۵) اگر اس آیت سے خلافتِ علیؓ ثابت ہوتی ہے تو حضرت علیؓ کے بعد ان کی ساری اولاد کے لئے بھی ہونی چاہئے کیونکہ یہ سب اقاربِ رسول ہوئے۔ صرف چند افراد کی نام بنام تخصیص کیسے ثابت ہوئی نیز اولادِ حسنؓ کیوں خلافت سے محروم ہوئی؟ حضرت علیؓ کے علاوہ رسول اکرم ﷺ کے اور رشتہ دار بھی تھے مثلاً آپ کے چچا حضرت عباسؓ بھی تھے ان کے صاحبزادے حضرت عبداللہ بن عباسؓ بھی تھے۔ حضرت علیؓ کے حقیقی بھائی حضرت عقیلؓ بھی تھے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ، حضرت عثمانؓ ذوالنورین، حضرت ابوسفیانؓ اور حضرت معاویہؓ وغیرہ سے آپ کا صہری رشتہ ہے۔ اگر رشتہ داروں سے محبت کا حکم ہے تو اس میں سب اقارب شامل ہیں۔ اگر اقارب سے محبت کا مطلب انہیں خلیفہ بلافصل بنانا ہے تو باقی اقارب کو اس شرف سے کیسے محروم رکھا جاسکتا ہے؟ پس ثابت ہوا کہ زیر بحث آیت کا کسی کی بھی خلافت اور وہ بھی بلا فصل سے دور دور کا بھی کوئی تعلق نہیں۔ کسی بھی آیت کے ساتھ خبر واحد بلکہ ضعیف اور موضوع روایات تک کو شامل کرنے سے عقائد ثابت کرنے کا تکلف بجائے خود استدلال کے نہایت کمزور ہونے پر دلالت کرتا ہے۔

(ھ) بحوالہ آیت تطہیر

اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا (۱۲۵)

''سوائے اس کے نہیں کہ اللہ تعالیٰ ارادہ کرتا ہے کہ تم سے اے اہلِ بیت ناپاکی کو دور رکھے اور تمہیں خوب پاک صاف کردے''۔ ہمارے امامیہ بھائیوں کا کہنا ہے کہ آیت میں خطاب اہل بیت سے ہے اور اہل بیت سے مراد حضرت علیؓ، سیدہ فاطمہؓ اور حضرت امام حسنؓ اور حضرت امام حسینؓ ہیں کیونکہ رسول اکرم ﷺ نے ان چاروں کو کساء (چادر) کے نیچے بٹھا کر اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائی تھی۔ اللھم ھٰؤلاء اھل بیتی فطھرھم '' اے اللہ یہ میرے اہل بیت ہیں ان سے گندگی کو دور رکھ اور انہیں خوب پاک صاف کردے''۔ پس یہ چاروں معصوم ہیں اور معصوم ہی امام بن سکتا ہے۔

تبصرہ

(۱) مقالہ ہٰذا کے پہلے حصے میں یہ بخوبی واضح کیا جاچکا ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی طرف سے صحابہ کرامؓ کے اخلاق واطوار کی اصلاح وتادیب بھی مقصود تھی کیونکہ وہ اگر پہلے ہی سے تربیت یافتہ ہوتے تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت مبارکہ کی ضرورت ہی کیا تھی؟ اصلاح وتربیت کا یہ سلسلہ

لوگوں کے وقتاً فوقتاً دائرۂ اسلام میں آتے رہنے کی وجہ سے مسلسل جاری رہتا تھا۔ ایک مخلص ومشفق مربی اور مصلح تربیت واصلاح کے لئے سختی ونرمی دونوں سے کام لیتا ہے۔ زیر تربیت افراد کی اصلاح کے لئے انذار (ڈرانے) اور تبشیر (خوشخبری دینے) وعدہ ووعید ہر طرح کے طریقے استعمال کئے جاتے ہیں۔ تاہم صحابہ کرامؓ کو یہ عظمت وشرف حاصل ہے کہ گو بعض اوقات ان کی اصلاح کے لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں سخت لہجہ بھی اختیار فرمایا ہے لیکن ان کے مقام ومرتبے کو مجروح نہیں ہونے دیا تاکہ کج فہم لوگوں کے لئے ان کے متعلق کسی بدظنی میں مبتلا ہونے کا کوئی جواز باقی نہ رہے چنانچہ اسی موقع پر یا کسی دوسرے موقع پر ان صحابہ کرام کے لئے ایسا طرز کلام اختیار کیا گیا جس سے ان کی عظمت واضح ہوتی ہے مثلاً غزوہ احد میں انصار کے دو ذیلی قبیلے بنوسلمہ اور بنوحارثہ بزدلی کا مظاہرہ کرنے اور شریک جہاد نہ ہونے کا پختہ ارادہ کئے ہوئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے ان خفیہ عزائم کو ان کی اصلاح کے لئے بے نقاب فرمایا تو ساتھ ہی یہ بھی فرمایا وَاللّٰہُ وَلِیُّھُمَا (۱۲۶) ''اللہ ان دونوں قبیلوں کا ولی دوست اور کارساز ہے''۔ غزوۂ احد میں جو لوگ میدان چھوڑ گئے تھے ان کی اصلاح کے لئے فرمایا کہ ان لوگوں کو ان کے بعض گناہوں کی وجہ سے شیطان نے بہکا دیا تھا۔ (۱۲۷) لیکن ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے ان کی معافی کا ایک مرتبہ بصیغہ خطاب اور دوسری مرتبہ بصیغہ غائب دو مرتبہ اعلان فرمایا (۱۲۸) اپنے رسول کے دل کو ان کے لئے نرم کر دیا اور پھر رسول کو بھی حکم دیا کہ آپ بھی انہیں معاف کر دیں اور ان کے لئے استغفار کیا کریں اور اہم معاملات میں انہیں شریک مشورہ کیا کریں۔ (۱۲۹) غزوۂ حنین میں جو لوگ میدان چھوڑ گئے تھے ان کی اصلاح کے لئے انہیں مخاطب کرتے ہوئے فرمایا لَقَدْ نَصَرَکُمُ اللّٰہُ فِیْ مَوَاطِنَ کَثِیْرَۃٍ وَّ یَوْمَ حُنَیْنٍ اِذْ اَعْجَبَتْکُمْ کَثْرَتُکُمْ (۱۳۰) ''بلاشبہ اللہ نے تمہاری نصرت بہت سی جگہوں میں اور حُنین کے دن بھی کی''۔ اللہ کی نصرت ہمیشہ اس کے مقرب بندوں کے لئے ہوتی ہے۔ کفار اور فساق وفجار کو دنیا میں جو ظاہری کامیابی نظر آتی ہے وہ تو حقیقت میں استدراج (آہستہ آہستہ عذاب کی گرفت میں لینا) ہے۔

زیر بحث آیت تطہیر کا سیاق وسباق صاف بتا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ازواج رسول کو مخاطب کر کے ان کی اصلاح وتربیت فرمائی ہے۔ انہیں نرم وسخت دونوں لہجوں میں مخاطب کیا گیا ہے چونکہ کوئی بھی کم فہم ان کے متعلق غلط فہمی سے اور کوئی بھی معاند ومخالف قلبی بغض کی بنا پر ان کی بدگوئی کر سکتا تھا لہٰذا آیت تطہیر میں ازواج رسول کو اہل بیت کے الفاظ سے مخاطب کرتے ہوئے یہ اشارہ کر دیا گیا کہ سخت الفاظ میں ازواجِ رسول ﷺ کو مخاطب کرنے سے ہرگز ان کی توہین وتذلیل مقصود نہیں بلکہ اصلاح مطلوب ہے اور

یہ بشارت بھی دے دی گئی کہ اللہ تعالیٰ فی الواقع ان کی ایسی اصلاح فرمادے گا کہ بے حیائی والے جن جرائم اور گناہوں سے بچنے کی انہیں تاکید کی جارہی ہے ایسے رجس (گندگی) کو اللہ تعالیٰ ان سے ہمیشہ دور رکھے گا۔ اذہابِ رجس کا یہی صحیح مفہوم ہے جو اہلِ بیت کے شایانِ شان ہے چنانچہ ان ازواج کا کبھی بھی (معاذ اللہ) کوئی جنسی سکینڈل ہرگز ہرگز نہیں بنا حالانکہ رسول اکرم ﷺ کے انتقال کے وقت بعض امہات المؤمنین مثلاً حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بھرپور جوان تھیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں حضرت عائشہؓ پر تہمت لگانے والوں پر حدِ قذف جاری کی گئی اور صدیقہؓ کی برأت و بے گناہی پر مشتمل قرآنی آیات قیامت تک پڑھی جاتی رہیں گی۔ اگر اذہابِ رجس سے گندگی کو دور رکھنے کی بجائے گندگی دور کرنے کا بھی معنی لیا جائے تو مطلب واضح ہے کہ دلوں کی ایسی کیفیت جو انسانوں کو بتقاضائے بشریت بے حیائی کی طرف راغب کرتی ہے، ازواج مطہرات کے قلوب سے نکال دی جائیگی۔ تطہیر (پاک صاف اور ستھرا بنانے) کا مطلب یہ ہے کہ بتقاضائے بشریت ان سے جو کوتاہیاں بھی ہوں وہ معاف کردی جائیں گی۔ بالفظِ دیگر تطہیر سے عفو ذنوب مراد ہے۔ زیر بحث آیت تطہیر اپنے ماقبل اور مابعد یعنی سیاق و سباق سے مکمل طور پر مربوط اور ہم آہنگ ہے۔ جو شخص بھی قرآن کریم پر ایمان رکھتا ہو اور اسے اللہ کا کلام مانتا ہو وہ ہرگز ایسی نام نہاد دقیق صرفی ونحوی تحقیق کی سعی نامشکور میں مبتلا نہیں ہوگا جو اس کے خیال میں آیتِ تطہیر کو اپنے سیاق وسباق سے کاٹ کر رکھ دے کہ کلام میں بے ربطی عیب ہے اور اللہ کا کلام عیب سے پاک ہے اگر کہا جائے کہ حضرت عثمانؓ یا کسی اور نے آیات کی ترتیب کو بدل دیا ہے تو اگر یہ ترتیب اللہ اور اس کے رسول کی مرضی کے عین مطابق ہے تو اعتراض کیسا؟ اور اگر یہ ترتیب اللہ اور اس کے رسول کی مرضی کے خلاف ہے تو یہ تحریف ہی کی ایک صورت ہے۔ کسی کلام کے جملوں کی جگہ بدل دینا تو ایک طرف رہا، بسا اوقات رموزِ اوقاف تک بدل دینے سے مطلب خبط ہو جاتا ہے تو قرآن کریم کو کیسے محفوظ اور غیر محرف قرار دیا جائے گا؟ زیر بحث آیت تطہیر کا سیاق وسباق صاف ظاہر کر رہا ہے کہ اہلِ بیت سے مراد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج ہیں۔ لغت سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے سورہ ہود میں حضرت ابراہیم علیہ اسلام کی زوجہ محترمہ کو اہل بیت کہا گیا ہے۔ اَتَعْجَبِیْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰہِ رَحْمَتُ اللّٰہِ وَ بَرَکٰتُہٗ عَلَیْکُمْ اَھْلَ الْبَیْتِ اِنَّہٗ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ (۱۳۱) ''اے سارہ! زوجہ ابراہیم خلیل اللہ) کیا تو اللہ کے حکم اور فیصلے پر تعجب کرتی ہے؟ اے اہل بیت! تم پر اللہ کی رحمت اور اس کی برکتیں ہوں بے شک وہ قابل تعریف اور بزرگی کے لائق ہے''۔ اگر کہا جائے کہ حضرت سارہؓ حضرت ابراہیمؑ کی خالہ زاد یا ماموں زاد بھی تھیں اس لئے وہ اہل

بیت میں شامل ہیں تو رسول اکرم ﷺ کے عم محترم حضرت عباسؓ، ان کے صاحبزادے حضرت عبداللہ بن عباس اور آپ کے دوسرے چچازاد بھائی حضرت عقیل بن ابی طالب، حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہم ہمارے بھائیوں کے خیال میں کیوں اہل بیت میں شامل نہیں ہیں؟۔ الغرض لفظ اہل بیت ازواج کے لئے ہے۔ گھر میں رہنے والے دوسرے افراد اس میں ضمناً آجاتے ہیں اور اہل کے لئے صیغہ مذکر کا آتا ہے گو اطلاق عورتوں پر ہو جیسا کہ سابقہ آیات سے واضح ہو چکا ہے اور جیسے مثلاً حضرت موسیٰؑ نے اپنی اہلیہ سے کہا تھا۔ فَقَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْٓا اِنِّيْٓ اٰنَسْتُ نَارًا (۱۳۲) ''(حضرت موسیٰ نے) اپنی اہلیہ سے کہا کہ تم یہیں ٹھہرو میں نے آگ دیکھی ہے''۔ یہاں اہل سے بالاتفاق حضرت موسیٰؑ کی زوجہ محترمہ مراد ہیں لیکن لفظ ''اہل'' کے مذکر ہونے کی مناسبت سے ''امکثوا'' صیغہ جمع مذکر حاضر لایا گیا ہے۔

(۲) حدیث کساء کی رو سے سیدنا حضرت علیؓ، سیدہ فاطمہؓ، حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ بھی اہلِ بیت میں شامل ہیں۔ آیت اور حدیث میں قطعاً کوئی تعارض نہیں۔ ازواج مطہرات بہ نصِ قرآنی اہل بیت میں اور مذکورہ چار حضرات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا سے اہل بیت میں شامل ہو گئے ورنہ بتایئے کہ مذکورہ چاروں حضرات کے لئے دعائے تطہیر آیت تطہیر کے نزول سے پہلے ہوئی یا بعد میں؟ اگر پہلے ہوئی تو یہ حدیثِ کساء کے متن کے خلاف ہے اگر بموجب حدیث یہ دعا آیت کے نزول کے بعد ہوئی تو ثابت ہوا کہ مذورہ چاروں حضرات اہل بیت آیتِ تطہیر کے مفہوم میں پہلے داخل نہ تھے آپ کی دعا سے بعد میں وہ بھی اہلِ بیت میں داخل ہو گئے اسی لئے تو جب ام المؤمنین حضرت ام سلمہؓ نے چادر میں داخل ہونے کی خواہش ظاہر کی تو رسول اکرم ﷺ نے بموجب حدیث فرمایا تھا۔ انتِ علیٰ خیر، انتِ علیٰ مکانک '' تو پہلے ہی اس بھلائی میں داخل ہے تو پہلے ہی اپنے مقام پر (اہل بیت میں شامل) ہے''۔

(۳) اگر زیر بحث آیت تطہیر کی رو سے مذکورہ چاروں حضرات کا معصوم عن الخطا ہونا ثابت ہوتا ہے تو ازواج مطہرات کو بھی معصوم عن الخطا قرار دینا ہوگا کیونکہ وہی قرآنی اہل بیت ہیں جیسا کہ اوپر مذکور ہو چکا بلکہ سب صحابہ کرامؓ کو بھی معصوم عن الخطا سمجھنا چاہئے کیونکہ قرآن کریم میں صرف یہی ایک آیت تطہیر نہیں اس طرح کی اور بھی آیات ہیں مثلاً سورۂ مائدہ میں صحابہ کرامؓ کو مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے وَّلٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ (۱۳۳) ''لیکن اللہ چاہتا ہے کہ تمہیں پاک صاف کرے اور تم پر اپنی نعمت پوری کرے'' دیکھئے یہاں تطہیر کے ساتھ اتمام نعمت کی بشارت بھی ہے۔ نیز ارشاد ہے۔ وَيُذْهِبَ عَنْكُمْ رِجْزَ الشَّيْطٰنِ (۱۳۴) ''وہ چاہتا ہے کہ تم سے شیطان کی گندگی دور

کرے یا دور رکھے''۔ رجس اور رجز دونوں ہم معنی ہیں۔ سورۂ توبہ میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا گیا۔ خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا (۱۳۵) اے پیغمبر! تو ان اصحاب کے اموال سے صدقہ وصول کر جس کے ذریعہ تو ان کی تطہیر اور ان کا تزکیہ کرے'' دیکھئے یہاں صرف تطہیر ہی نہیں تزکیہ کا لفظ بھی ساتھ لایا گیا ہے جس کا معنیٰ ہے'' صاف اور ستھرا کرنا''۔ تطہیر اور تزکیہ دونوں ہم معنیٰ ہیں اور یہاں ایک دوسرے کی تفسیر کرتے ہیں اس کے بعد اس آیت کے آخر میں ارشاد ہے وَصَلِّ عَلَيْهِمْ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ'' تو ان کے لئے دعائے رحمت کر بے شک تیری دعا ان کے لئے تسکین ہے''۔ دیکھئے صحابہ کرامؓ کو تطہیر و تزکیہ کے ساتھ دعائے رحمت بھی حاصل ہوگئی۔ سورہ حجرات میں ہے۔ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَ الْعِصْيَانَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ (۱۳۶)''لیکن اللہ نے ایمان کو تمہارے لئے محبوب بنایا اور اسے تمہارے دلوں میں مزین کیا اور کفر، فسوق اور نافرمانی سے تمہارے دلوں میں نفرت پیدا کر دی یہی وہ لوگ نیک ہیں''۔ قرآن کریم میں جا بجا رسول اللہ ﷺ کو نہ صرف معلم کتاب وحکمت کہا گیا ہے بلکہ مزکی بھی قرار دیا گیا ہے مثلاً وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ (۱۳۷) یہ رسول ان کو کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے اور ان کا تزکیہ کرتا ہے''۔ تطہیر اور تزکیہ کا مفہوم ایک ہی ہے۔ اگر صحابہ کرامؓ ان آیاتِ تطہیر و تزکیہ کے باوجود معصوم عن الخطا نہیں تو زیر بحث آیتِ تطہیر سے بھی کسی کا معصوم عن الخطا ہونا ثابت نہیں ہوتا بلکہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ تطہیر یعنی عفو ذنوب کی یہ نعمت سب ہی صحابہ کرام کو حاصل ہوگئی اس میں ازواج مطہرات یا حدیث کساء کے بموجب مذکورہ بالا چار حضرات ہی کی تخصیص نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سب صحابہ کرامؓ کے متعلق ارشاد ہے۔ يَوْمَ لَا يُخْزِي اللّٰهُ النَّبِيَّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ (۱۳۸)''بروز قیامت اللہ نبی کو اور اس نبی کے ساتھ ایمان لانے والے اصحاب رسول کو رسوا نہیں کرے گا''۔ تاہم اہل بیت میں شامل ہونا ایک اضافی فضل وشرف ہے جو دوسروں کو حاصل نہیں ہے۔

(۴) اگر آیت تطہیر اور حدیث کساء کی رو سے مذکورہ چاروں نفوس قدسیہ رضی اللہ عنہم معصوم عن الخطاء ہیں تو کیا یہ مرتبہ انہیں چادر کی برکت سے حاصل ہوا یا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا سے؟ اگر چادر سے حاصل ہوا تو ازواج مطہرات کے سروں پر سالہا سال تک رسول اللہ ﷺ کی چادر رہے وہ تو معصوم نہ ہوں لیکن مذکورہ چاروں حضرات پر چند لمحوں کے لئے رسول اکرم ﷺ کی چادر ڈالی جائے تو وہ معصوم عن الخطا ہو جائیں۔ آخر ایسا کیوں ہے جبکہ بقول ہمارے بھائیوں کے اللہ تعالیٰ پر عدل بھی

واجب ہے۔ اگر یہ مرتبہ ان حضرات کو رسول اکرم ﷺ کی دعا سے حاصل ہوا تو قرآن کریم میں جا بجا رسول اکرم ﷺ کو سب صحابہ کرامؓ کے لئے دعائے استغفار اور دعائے رحمت کا حکم دیا گیا ہے یقیناً، آپ نے اس حکم کی تعمیل فرمائی اور جب بھی حکم ہوا تو آپ نے دعا فرمائی۔ حدیث کساء کی رو سے ایک ہی مرتبہ کی دعا سے یہ حضرات تو معصوم عن الخطا ہو جائیں اور صحابہ کرام کے لئے قرآن کی رو سے متعدد مرتبہ دعا فرمائیں تو ان کی عظیم اکثریت (معاذ اللہ) مغفور و مرحوم نہ ہوا سے کون عقل مند قبول کرے گا؟ یہاں پھر یہ ملحوظ رہے کہ ہمارے بھائیوں کے بقول اللہ پر عدل واجب ہے۔

(۵) کیا مذکورہ چاروں حضرات رسول اکرم ﷺ کی دعا تطہیر سے پہلے ہی معصوم عن الخطا تھے یا بعد میں ہوئے؟ دوسری شق کو ہمارے امامیہ بھائی نہیں مانتے کیونکہ بقول ان کے ائمہ معصومین ہیں اپنی ولادت باسعادت کے وقت سے ہی معصوم ہوتے ہیں پس ان کے نزدیک پہلی شق ہی صحیح ہو سکتی ہے کہ یہ حضرات دعائے تطہیر سے پہلے ہی معصوم تھے تو غور کیجئے پھر دعا کی ضرورت ہی کیا تھی یہ تو تحصیلِ حاصل ہے۔ آیت تطہیر کے الفاظ ''یرید، لیذھب، لیطہر'' کم سب کے سب فعل مضارع کے صیغے ہیں ان میں کوئی بھی ماضی کا صیغہ نہیں۔ الغرض جو نعمت پہلے ہی حاصل ہو چکی اسے مانگنا تحصیل حاصل ہے مثلاً یہ ہرگز نہ ہوگا کہ ظہورِ رسالت کے بعد کوئی رسول یہ دعا بھی مانگتا رہے کہ اے اللہ مجھے رسول بنا دے یا کوئی دوسرا رسول اس کے متعلق ایسی دعا ہرگز نہیں کریگا۔ یہاں یہ شبہ نہیں ہونا چاہئے کہ صحابہ کرامؓ سے جب اللہ تعالیٰ راضی ہو چکا تو انکے لئے دعائیہ جملہ رضی اللہ عنہم کیوں استعمال کیا جاتا ہے کیونکہ دعا سے بعض اوقات تعظیم کا اظہار مقصود ہوتا ہے اور عربی میں ایسے دعائیہ جملوں میں فعل ماضی کا صیغہ استعمال ہوتا ہے جبکہ حدیث کساء والی دعائے تطہیر میں فعل امر کا صیغہ ہے نیز صحابہ کرامؓ سے اللہ تعالیٰ کی رضامندی کی عملی تعبیر بروز قیامت عالم آخرت میں سامنے آئے گی لہذا ان کے لئے رضی اللہ عنہم کا دعائیہ جملہ درست رہے گا لیکن ایسا نہیں ہو سکتا کہ کوئی جنت کے اعلیٰ مقام پر فائز ہونے کے بعد بھی یہ دعا مانگے کہ اے اللہ! جو مقام مجھے تو نے عطا فرما دیا ہے، اسے عطا فرما دے کیونکہ یہ تحصیلِ حاصل ہے تو جب مذکورہ چاروں حضرات اگر پیدائشی طور پر معصوم ہیں تو ان کے لئے دعاء تطہیر تحصیل حاصل ہونے کی وجہ سے سراسر بے معنی ہوگی۔ رسول اکرم ﷺ کے لئے صلوٰۃ (درود شریف) میں تعظیم اور دعا دونوں مقصود ہیں لہذا اس کے لئے ماضی اور امر دونوں طرح کے صیغے مستعمل ہیں نیز رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ تعالیٰ کی رحمتِ کاملہ کا کامل عملی ظہور بھی عالم آخرت میں ہوگا پھر اللہ کی رحمت کی تحدید مخلوق کے لئے محال ہے لہذا صلوٰۃ وسلام کے کلمات درست رہیں گے۔

(۶) حضرات انبیا علیہم السلام اللہ تعالیٰ سے وحی حاصل کرتے ہیں ان کے اس تجربے میں کوئی دوسرا ان کا شریک نہیں ہوتا۔ نبی اگر وحی کے اخذ کرنے میں، اسے لوگوں تک پہنچانے اور اس کی تشریح وتبیین میں غلطی کرے تو پورے دین سے ہی اعتماد اٹھ جائے گا لہذا نبی کا معصوم عن الخطا ہونا ضروری ہے۔ لیکن دوسروں کے لئے اس دین کی تبلیغ اور نشر واشاعت کے سلسلے میں معصوم ہونا ہرگز ضروری نہیں کیونکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل تو نبوت جاری تھی آپ کی بعثت کے بعد نبوت کا دروازہ بند کر دیا گیا تو دین میں غلطی سے بچنے کا اہتمام یوں ہوا کہ اگر ایک عالم غلطی کرے گا تو دوسرا اس کی اصلاح کر دے گا۔ دوسرا غلطی کرے گا تو تیسرا اس کی اصلاح کر دے گا۔ ساری امت ہرگز کسی غلطی پر جمع نہ ہوگی اور جن فروعی مسائل میں شریعت نے انسانوں کو یقین قطعی حاصل کرنے کا پابند نہیں کیا ان میں اجتہادی غلطی ویسے ہی معاف ہے، لہذا دین کی تبلیغ اور تشریح کے لئے کسی معصوم عن الخطا عالم، مبلغ، امام یا خلیفہ کی ضرورت نہیں ورنہ ہر ماں کو معصوم ہونا چاہئے کہ بچے کا اولیں مدرسہ ماں کی گود ہے۔ ہر باپ کو بھی معصوم ہونا چاہئے۔ مسجد کے امام وخطیب کو بھی معصوم ہونا چاہئے۔ تمام مدارس وکلیات کے اساتذہ کو اور تمام عدالتوں کے منصفین اور قاضیوں کو بھی معصوم ہونا چاہئے تمام حکام کو بھی بشمول حاکم اعلیٰ معصوم ہونا چاہئے کیونکہ ماتحت حکام کا حاکم اعلیٰ سے ہر ہر معاملے اور ہر ہر جزئی میں حاکم اعلیٰ سے ہمہ وقت رابطہ عادۃً وعملاً محال ہے۔ نیز آج کون سا ایسا حاکم اعلیٰ امام یا خلیفہ معصوم عن الخطا ہے؟ اگر کہا جائے کہ یہ حضرت امام مہدی رضی اللہ عنہ ہیں جو سینکڑوں برس سے غائب ہیں تو ان کی غیبت میں ان کے نام نہاد نائبین معصوم ہیں یا غیر معصوم؟ اگر معصوم ہیں تو ائمہ معصومین بارہ یا چودہ نہ رہے بلکہ لاتعداد ہو گئے۔ اگر غیر معصوم ہیں تو ثابت ہوا کہ دین کی تبلیغ اور تشریح کے لئے کسی معصوم عن الخطا مبلغ یا عالم کا ہونا ضروری نہیں۔

(۲) جو دینی مسائل قرآن وسنت سے یقین کے ساتھ حاصل کئے جاسکیں تو ان میں کسی معصوم عن الخطا امام کی ضرورت نہ رہی۔ اگر دینی مسائل قرآن وسنت سے یقین کے ساتھ حاصل نہ کئے جاسکیں تو ایسے مسائل میں ائمہ مجتہدین اجتہاد کریں گے۔ اگر ان کا اجتہاد بالفرض غلط بھی ہوا تو ان کی خطا معاف ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ہمیں دعا سکھائی ہے کہ اے اللہ! اگر ہم سے نسیان سرزد ہو یا خطا ہو جائے تو ہمارا مواخذہ نہ کیجئے (۱۳۹) ناممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ خود ہی دعا سکھائے اور خود ہی خطا پر مواخذہ کرے بلکہ اجتہادی مسائل میں اجتہاد کے اہل مجتہد سے غلطی ہو جائے تو اسے اکہرا اجر ملے گا اور اگر وہ صحیح اجتہاد کرے تو اسے دہرا اجر ملے گا (۱۴۰) پس اجتہادی مسائل کے لئے بھی معصوم عن الخطا امام کی ضرورت نہ رہی یہاں ظن پر عمل کافی

ہوگا ورنہ اگر ہر دور کے لئے معصوم عن الخطا امام ضروری ہو تو تمام متنازعہ مسائل میں خصوصاً جن سے سر پھٹول اور تفرقہ پیدا ہوتا ہو، امام سے رجوع کر کے صحیح وغلط میں یقینی امتیاز کرنا ضروری ہوگا لیکن خود امامیہ حضرات بھی اس کے قائل نہیں جیسا کہ حدیث ثقلین کے مباحث میں پوری طرح واضح کیا جا چکا ہے۔

(۸) سورۂ فرقان میں اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کی ایک صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ ان کی دعاؤں میں یہ مضمون بھی شامل ہوتا ہے وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا (۱۴۱) '' اے اللہ ہمیں متقی لوگوں کا امام اور پیشوا بنا دے''۔ یہ دعا کسی خاص فرد، گروہ، قوم یا نسل کے لئے مخصوص نہیں ہے اب جن لوگوں کے حق میں یہ دعا قبول ہوگی اور وہ امام المتقین بنیں گے اگر وہ معصوم عن الخطا ہونگے تو ان کی تعداد غیر محدود ہوگی اگر غیر معصوم ہونگے تو ثابت ہوا کہ امام المتقین کا معصوم ہونا ضروری نہیں البتہ ایسی امامت ظالموں کو نہیں ملتی ظلم کی ضد عدل ہے، عصمت عن الخطا (خطا سے معصوم ہونا) نہیں ورنہ اگر ہر غیر معصوم کو ظالم قرار دیا جائے تو قرآن کریم میں ہے۔ وَلَا تَرْكَنُوْا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّار (۱۴۲) '' تم ظالموں کی طرف نہ جھکو ایسا نہ ہو کہ تمہیں بھی آگ چھو لے''۔ اب دیکھئے مثلاً حضرت علیؓ نے اپنے دور خلافت میں جن لوگوں کو صوبوں کا عامل مقرر فرمایا تھا وہ بالاتفاق غیر معصوم تھے اگر وہ غیر معصوم ہونے کی وجہ سے ظالم تھے تو اللہ تعالیٰ نے تو ظالموں کی جانب میلان پر وعید سنا دی ہے چہ جائے کہ ظالموں کو صوبوں کا عامل بنا کر انہیں لوگوں پر مسلط کر دیا جائے۔ پس ثابت ہوا کہ ظلم کی ضد عدل ہے۔ ہر وہ شخص جو گناہ سے بچے اور گناہ سرزد ہونے پر توبہ کرے اور کبیرہ گناہوں پر اصرار نہ کرے، حقوق اللہ اور حقوق العباد کے پورا کرنے میں پر خلوص کوشش کرتا رہے وہ عادل ہوگا۔ اس کا معصوم عن الخطا ہونا ضروری نہیں پس ہر معصوم گو لازماً عادل بھی ہوگا لیکن ہر عادل کا معصوم ہونا ضروری نہیں۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے مہاجرین و انصار کی بارہا مدح فرمائی ہے۔ اگر مہاجرین کے متعلق کوئی یہ بہانہ کرے کہ ان سے صرف حضرت علیؓ، سیدہ فاطمہؓ اور حضرات حسنینؓ ہی مراد ہیں تو انصار کے متعلق تو یہ تاویل نہیں چل سکتی جو بالاتفاق غیر معصوم ہیں۔ اگر ہر غیر معصوم ظالم ہو تو ظالموں کی مدح کیسی؟ یہ خلاف عقل تو ہے ہی قرآن کریم سے بھی ہرگز کوئی ایسی مثال نہیں ملے گی کہ اللہ تعالیٰ نے کسی کو ظالم بھی کہا ہو اور پھر اس کی مدح بھی فرمائی ہو، ہاں اگر وہ ظالم نہ رہے بلکہ عادل ہو جائے تو اور بات ہے۔ قرآن کریم میں ہے اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى (۱۴۳) انصاف کرو یہ عدل سے قریب تر ہے''۔ یہ حکم بالاتفاق معصوم اور غیر معصوم سب کے لئے ہے پس ثابت ہوا کہ غیر معصوم بھی عادل ہو سکتا ہے ورنہ اسے عدل کا حکم دینا بیکار ہوتا۔ اللہ کا کلام ہر عیب سے پاک ہے۔

(۹) جو رسول نہیں اسے خواہ امام کہیں یا کچھ اور، زیادہ سے زیادہ وہ اولوالامر (حکام و علما) میں ہی شامل ہوگا قرآن کریم میں ہے کہ ''اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور جو تم میں اولوالامر ہیں ان کی اطاعت کرو تو اگر تمہارا کسی معاملے میں جھگڑا ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول (قرآن وسنت) کی طرف لوٹاؤ۔ یہی بہتر ہے اور اس کا انجام خوب تر ہے (۱۴۴) اب اگر امام کو اللہ قرار دیا جائے تو یہ کھلا شرک ہے۔ اگر اسے رسول قرار دیا جائے تو یہ ختم نبوت کا کھلا انکار ہے۔ اگر اسے اولوالامر میں شامل کیا جائے تو قرآن کریم سے ثابت ہو چکا کہ دینی مسائل میں اولوالامر سے اختلاف اور جھگڑا ممکن ہے جسکے حل کے لئے قرآن وسنت کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ اگر امام معصوم عن الخطا ہو تو اس سے اس طرح کے اختلاف کی قطعاً کوئی گنجائش ہی نہیں، پس ائمہ کرام و دیگر تمام غیر نبی حضرات معصوم عن الخطا نہیں، انہیں انبیا سے بھی اونچا مقام عطا کرنا محض غلو ہے ایسی عقیدت حقیقت سے ہم آہنگ نہیں۔

(۱۰) حقیقت یہ ہے کہ کسی کے معصوم عن الخطا نہ ہونے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ لازماً گناہ گار اور ظالم بھی ہو۔ ہر گناہ گو خطا ہے لیکن ہر خطا ہرگز گناہ نہیں بلکہ مجتہد کو خطائے اجتہادی پر بھی ثواب ملتا ہے۔ علم کا معتبر ترین ذریعہ وحی ہے اگر کوئی شخص غلو سے کام لیتا ہوا رسول اکرم ﷺ کے بعد کسی اور کے لئے بھی رسولوں اور نبیوں سے اونچا درجہ تسلیم کرے حتی کہ اس پر وحی کے نزول کا بھی اقرار کرے تو ہم اس سے یہ پوچھنے میں حق بجانب ہونگے کہ آیا ایسے کسی شخص پر وہ رسول اور نبی کے الفاظ بھی استعمال کرتا ہے یا نہیں؟ اگر کرتا ہے تو گویا ایک طرح کا ختم نبوت کا انکار پہلے ہی تھا مگر اب تو وہ کھلم کھلا ختم نبوت کا منکر ہوگیا۔ اگر استعمال نہیں کرتا تو قرآن کریم میں آچکا ہے کہ اللہ تعالیٰ غیب کی یقینی اطلاع صرف اور صرف رسول کو دیا کرتا ہے۔ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ (۱۴۵) '' اللہ تعالیٰ ایسا نہیں ہے کہ تمہیں غیب کی اطلاع دے لیکن اللہ (اس مقصد کے لئے) اپنے رسولوں میں سے جسے چاہے اسے منتخب کرتا ہے (اور جو بھی اطلاع اسے دینا چاہے دیتا ہے)''۔ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا ۝ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ (۱۴۶) '' وہ غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا مگر ایسے رسول کو مطلع کرتا ہے جسے اس نے پسند کر کے چن لیا ہو''۔ غیبی امور کی بظاہر اطلاع اولیا کو بذریعہ کشف و الہام ہوتی ہے۔ نجومی اور دست شناس وغیرہ بھی ایسی خبریں دیتے ہیں لیکن قرآن کریم میں ہے کہ غیب پر ہم صرف اپنے رسولوں کو ہی مطلع کرتے ہیں تو ثابت ہوا کہ جو رسول نہیں غیب پر اس کی اطلاع یقینی و قطعی نہیں بلکہ ظنی ہوگی جس میں خطا کا احتمال بھی ہے جبکہ رسول کو غیب پر جو اطلاع دی جاتی ہے وہ یقینی ہوتی

ہے ظنی نہیں ہوتی۔ پس بخوبی ثابت ہو گیا کہ جو رسول نہیں اس کا معصوم عن الخطا ہونا ضروری نہیں۔ مذکورہ قرآنی آیات میں سیاق وسباق کی روشنی میں صاف واضح ہے کہ ان آیات میں لفظ ''رسول'' اپنے اصطلاحی معنی میں ہے لہذا کسی فاسد تاویل کی کوئی گنجائش بھی نہیں۔

(۱۰) اگر ہر زمانے کے لئے زندہ امام کا بطور حجت ہونا ضروری ہے تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کوئی پونے چھ سو سال پر محیط درمیانی عرصے میں کون سے امام آتے رہے؟ اگر کہا جائے کہ خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام زندہ ہیں لہذا وہی امام تھے تو وہ آسمان پر زندہ ہیں نہ کہ زمین پر موجود ہیں نیز امام لوگوں کی اصلاح وتربیت کا ذمہ دار ہوتا ہے لیکن سورۂ مائدہ کے آخری رکوع میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا بروز قیامت اللہ تعالیٰ سے جو مکالمہ مذکور ہے اس میں یہ بھی ہے کہ اے اللہ! جب تو نے مجھے اٹھالیا تو (میں نہیں بلکہ) تو ہی ان لوگوں پر نگہبان تھا اور تو ہر چیز پر گواہ ہے (۱۴۷) پس حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان پر زندہ ہونے سے مبینہ امامت کی ضرورت ختم نہیں ہو گئی تھی۔ لیکن اس درمیانی عرصے میں کوئی امام نہیں آیا جو منصوص من اللہ اور معصوم عن الخطا ہو، اگر آیا ہے تو اس کی نشاندھی ہونی چاہئے۔ لہذا امامت کے یہ مخصوص تصورات درست نہیں ہیں۔

(۱۱) زیر بحث آیت تطہیر سے پہلے وقرن فی بیوتکن (تم اپنے گھروں میں رہا کرو) کا یہ مطلب نہیں کہ ازواج مطہرات شرعی احکام مثلاً مسجد نبوی میں نماز باجماعت اور خانہ کعبہ کے حج کے لئے بھی باہر نہ نکل سکتی تھیں۔ خود سیدہ فاطمہؓ بھی شرعی ضروریات کے لئے گھر سے باہر تشریف لے جاتی تھیں۔

(۱۲) کسی بھی جملہ شرطیہ کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ کہ شرط وجزاء کا وقوع اور ظہور بھی بہر حال ضروری ہے مثلاً رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے۔ فَاِنْ كُنْتَ فِيْ شَكٍّ مِّمَّا اَنْزَلْنَا اِلَيْكَ فَاسْئَلِ الَّذِيْنَ يَقْرَئُوْنَ الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكَ (۱۴۸) ''تو اگر تجھے شک ہے اس کتاب کے متعلق جو ہم نے تیری طرف اتاری ہے پھر تو سابقہ اہل کتاب سے پوچھ لے''۔ آیت کا یہ مطلب نہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو واقعی قرآن کریم پر کوئی شک ہو چلا تھا اور واقعی آپ نے اہل کتاب سے یہ رفع کرایا تھا۔ اسی طرح آیت تطہیر کے سیاق وسباق میں ازواج مطہرات کو جو تنبیہات کی گئی ہیں ان کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ ان گناہوں کے ارتکاب کا (معاذ اللہ) کوئی ارادہ کئے بیٹھی تھیں یا بعد میں انہوں نے ایسا کوئی کام کیا تھا بلکہ زیر بحث آیت تطہیر نے ہی ان تمام شبہات کی جڑ کاٹ کر رکھ دی ہے۔

(۱۳) اگر آیت تطہیر سے سیدنا حضرت علیؓ، سیدہ فاطمہؓ اور حضرات حسنینؓ معصوم عن الخطا ہو گئے تو سیدہ فاطمہؓ کو امامت سے کیوں محروم کیا گیا ہے حالانکہ چادر ان پر بھی ڈالی گئی تھی اور دعائے تطہیر میں بھی وہ شامل ہیں۔ نیز باقی نو ائمہ کی نام بنام اصطلاحی امامت آیتِ تطہیر سے کیسے ثابت ہوئی؟ اور اولاد حسنؓ کو اس اصطلاحی امامت سے کیوں محروم رکھا گیا؟

(۱۴) قرآن کریم کی رو سے رسول اکرم ﷺ کے اہل بیت صرف آپ کی بیویاں ہیں۔ مذکورہ بالا چاروں حضرات کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل بیت میں قرار دیا۔ اسی طرح بیہقی اور ابن ماجہ وغیرہ کتب میں مذکور حدیث کے مطابق آپ نے اپنے عم محترم حضرت عباسؓ اور ان کے بیٹوں پر بھی اپنی چادر ڈالی تھی۔ انہیں بھی اہل بیت قرار دیا اور ان کے لئے بھی دعائے تطہیر فرمائی۔ صحیح مسلم میں حضرت زیدؓ بن ارقم سے جو حدیث ثقلین مروی ہے اس میں ال علیؓ ال جعفرؓ، ال عقیلؓ اور ال عباسؓ سب ہی کو اہل بیت میں شمار کیا ہے۔ لغوی معنی اور قرآنی تصریح کے مطابق اصل اہل بیت تو ازواج مطہرات ہیں۔ باقی حضرات تبعاً اہل بیت میں داخل ہیں جیسے حقیقی سید تو حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ ہیں، ان کی نیک اولاد کو تبعاً سید کہا جاتا ہے۔

(و) بحوالہ آیتِ امامت ابراہیمی

وَاِذِ ابْتَلٰى اِبْرٰهِيْمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ قَالَ اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِىْ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِى الظّٰلِمِيْنَ (۱۴۹)'' (وہ وقت قابل ذکر ہے) جب ابراہیم کی اس کے ربّ نے کئی باتوں میں آزمائش کی تو اس نے انہیں پورا کر دکھایا تو اللہ نے کہا کہ میں تجھے لوگوں کا امام بنانے والا ہوں۔ (ابراہیم نے) کہا کہ یہ منصب میری اولاد میں بھی ہو تو (اللہ نے) کہا میرے وعدے کو ظالم لوگ نہیں پائیں گے''۔ ہمارے امامیہ بھائیوں کا یہ استدلال ہے کہ حضرت ابراہیم نبی تو پہلے ہی تھے امامت بعد میں ملی ہے لہٰذا امام کا درجہ نبی سے بلند ہوتا ہے اور امامت نبوت سے بلند تر مقام ہے۔ نیز امام کا معصوم ہونا ضروری ہے کیونکہ گناہ گار ظالم ہوتا ہے اور بموجب آیت عہدۂ امامت ظالموں کو نہیں دیا جاتا۔

تبصرہ

(۱) قرآن کریم میں لفظ امام اپنے لغوی معنیٰ پیشوا، سردار، رہبر ورہنما میں ہے، خواہ یہ پیشوائی اچھے امور میں ہو یا برے میں۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہے۔ فَقَاتِلُوْۤا اَئِمَّةَ الْكُفْرِ اِنَّهُمْ لَاۤ اَيْمَانَ لَهُمْ (۱۵۰)'' تو کفر کے اماموں کے خلاف جنگ کرو بے شک ان ائمہ کفر کی قسموں کا کوئی اعتبار نہیں ہے''۔

نیز فرعون اور اس کے ساتھیوں کے متعلق ارشاد ہے۔ وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ (۱۵۱)'' ہم نے انہیں ایسے امام بنایا تھا جو لوگوں کو جہنم کی راہ دکھاتے تھے''۔ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ لفظ'' جعلنا'' سے لازماً کسی کا منصوص من اللہ ہونا ثابت نہیں ہوتا ورنہ فرعون کو بھی (معاذ اللہ) منصوص من اللہ امام ماننا ہوگا۔ قرآن کریم میں امام اور ائمہ کے الفاظ رسول، رُسل، نبی اور انبیا کی طرح کسی دینی اصطلاح کو ظاہر نہیں کرتے جس پر ایمان لانا فرض ہو اور جس کا انکار کفر ہو ورنہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی صاف صاف ''امام'' قرار دے کر لوگوں کو حکم دیا جاتا کہ وہ آپ کو رسول اللہ کے ساتھ ساتھ امام بھی لازماً کہا کریں لیکن قرآن کریم میں اس طرح کا کوئی مضمون رسول اکرم ﷺ کے متعلق نہیں حالانکہ آپ بالاتفاق بعد از خدا بزرگ توئی کے مصداق ہیں۔ تو لغوی معنی کے اعتبار سے رسول اکرم ﷺ گو بلاشبہ سب اماموں کے بھی امام ہیں لیکن قرآن کریم میں کہیں بھی آپ کے لئے خاص لفظ ''امام'' نہیں لایا گیا کہ امامت کو بطور دینی اصطلاح اخذ کیا جائے۔ رسالت و نبوت یعنی اللہ کی طرف سے صاحبِ وحی ہونا بالاتفاق ایک وہبی نعمت ہے جو ذاتی محنت، جد و جہد، کسب و اکتساب، دعا و ریاضت سے حاصل نہیں ہوسکتی۔ اسی لئے لوگوں کو ایسی کسی دعا کی قطعاً تعلیم نہیں دی گئی کہ اے اللہ مجھے نبی بنا دے۔ اس کے برعکس کسی قوم یا جماعت کی علمی پیشوائی اور رہنمائی کرنا اسباب عادیہ کے تحت سراسر اختیاری عمل ہے لہذا یہ نعمت کسبی اور اکتسابی ہے یہی وجہ ہے کہ ہمیں قرآن کریم میں یہ دعا سکھائی گئی ہے۔ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا (۱۵۲)'' اے اللہ! ہمیں متقین کا امام بنا دے''۔ چونکہ تمام حضرات انبیا علیہم السلام ظہور نبوت کے بعد اپنے ارادے اور اختیار سے لوگوں کی رہنمائی فرماتے ہیں لہذا قرآن کریم سے بھی ثابت ہے کہ امامت ایک اکتسابی نعمت ہے۔ زیر بحث آیت امامتِ ابراہیمی میں بھی یہ بتایا گیا ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام چند در چند آزمائشوں میں مبتلا ہوئے اور اپنے ارادے اختیار اور عمل سے ان آزمائشوں پر پورے اترے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں امام بنایا۔ چونکہ آزمائشوں پر پورا اترنا اختیاری فعل ہے لہذا ہر نبی اور ہر رسول لازماً امام بھی ہے کیونکہ اگر وہ اپنے ارادے اور اختیار سے لوگوں کی پیشوائی نہیں کرے گا اور ان کی رہنمائی نہیں فرمائے گا تو اس کی بعثت ہی بیکار ٹھہرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سورہ انبیا میں حضرت ابراہیم، حضرت اسحاق، حضرت لوط اور حضرت یعقوب علیہم السلام سب کو امام کہا۔ وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا (۱۵۳) ہم نے انہیں امام بنایا جو لوگوں کو ہمارے حکم سے ہدایت کرتے تھے''۔ سورہ سجدہ میں بنی اسرائیل کے متعلق ارشاد ہے۔ وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يُوْقِنُوْنَ (۱۵۴)'' ہم نے ان کو ایسے امام بنایا جو ہمارے حکم سے ہدایت کرتے تھے جب انہوں

نے صبر کیا اور وہ ہماری آیتوں پر یقین رکھتے تھے''۔ صبر کرنا ایک اختیاری فعل ہے جس کے نتیجے میں اللہ نے انہیں امام قرار دیا ہے۔ پس نبوت وہبی ہے تو امامت سراسر اکتسابی نعمت ہے۔

(۲) دینی امور میں لوگوں کی رہنمائی یا خود نبی کرے گا یا نبی کے وارث اہلِ علم لوگوں کی رہنمائی کریں گے۔ نبی کی یہ پیشوائی ''امامتِ نبوت'' ہے اور غیر نبی اہل علم کی یہ پیشوائی ''امامتِ نیابتِ نبوت'' ہے جسے امامتِ نبوت کے مقابلے میں مختصراً امامتِ نیابت بھی کہا جا سکتا ہے۔ اوپر یہ ثابت ہو چکا ہے کہ نبوت وہبی نعمت ہے تو امامت اکتسابی نعمت ہے جبکہ ہمارے امامیہ بھائی ائمہ اہل بیت کو پیدائشی طور پر امام مانتے ہیں۔ زیر بحث آیت امامت ابراہیمی سے صاف صاف معلوم ہو رہا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آزمائشوں میں کامیاب ہونے پر امامت ملی تھی تو اس آیت میں مذکور امامتِ نبوت کا ہمارے بھائیوں کی مزعومہ امامت سے کوئی تعلق ہی نہیں تو استدلال کیسے درست ہوا؟۔ اگر درست بھی ہو تو نام بنام بارہ ائمہ کی تعیین کیسے ثابت ہوئی حالانکہ اولاد ابراہیم میں بنی اسرائیل اور بنی اسماعیل دونوں شامل ہیں اور یہ کہنا ہرگز درست نہیں کہ ان بارہ ائمہ کے سوا کوئی اور امام نہیں، اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل اور انبیائے بنی اسرائیل کو ائمہ ہدایت قرار دیا ہے جیسا کہ متعلقہ قرآنی آیات مذکور ہو چکی ہیں۔ یہ کہنا بھی درست نہیں کہ آلِ ابراہیم میں حضرات انبیا علیہم السلام کے سوا باقی سب کے سب ظالم تھے لہٰذا امام نہیں ہو سکتے کیونکہ ظلم کی ضد عدل ہے، عصمت نہیں جیسا کہ ہم آیت تطہیر کے مباحث میں بخوبی واضح کر چکے ہیں۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ ظلم کی ضد عصمت ہے تو بھی ان بارہ ائمہ کی تخصیص محتاج دلیل ہے۔ بارہ خلفا والی حدیث سے بھی استدلال درست نہیں کیونکہ اس حدیث میں بھی ناموں کی تخصیص نہیں اور پھر ان بارہ ائمہ میں سے خلافت ارضی بالفعل صرف حضرت علیؓ اور حضرت حسنؓ کو ہی حاصل ہوئی گو حضرت حسنؓ بھی بعد میں امیر معاویہؓ کے حق میں دستبردار ہو گئے باقی سب نے اپنے دور کے خلفا کی بیعت کی۔

(۳) اگر آیت امامت ابراہیمی سے بارہ ائمہ کی امامت ثابت ہوتی ہے تو اولادِ حسن رضی اللہ عنہ اس سے کیوں محروم ہے؟ اگر ائمہ کی تعداد محدود ہے تو یہ قرآنی دعا کہ ہمیں متقین کا امام بنا دے (معاذ اللہ) بے کار ہو گی اللہ کا کلام عیب سے پاک ہے۔ ائمہ بے شمار ہو سکتے ہیں اور ہوئے ہیں ان کا معصوم ہونا ضروری نہیں نبی بوجہ نبوت معصوم عن الخطا ہوتا ہے جو وہبی نعمت ہے نہ کہ بوجہ امامت جو اکتسابی نعمت ہے پس ہر نبی امام بھی ہے لیکن ہر امام کا نبی ہونا ضروری نہیں چنانچہ زیر بحث آیت امامت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو امام قرار دینے کا یہ مطلب نہیں کہ باقی انبیا امام نہیں تھے اللہ تعالیٰ نے باقی انبیا کو بھی امام کہا ہے قرآن کریم میں آیت امامت صرف یہی نہیں بلکہ آیاتِ تطہیر کی طرح آیاتِ امامت بھی متعدد ہیں۔ ہر نبی

امام ہے لیکن ہر ایک کی امامت و پیشوائی اور اس کے ثمرات یکساں نوعیت کے نہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی امامتِ نبوت نہایت بلند درجہ کی ہے اور آپ کی اولاد میں بے شمار نبی اور امام ہوئے انی جاعلک للناس اماما کا مطلب واضح ہے کہ آپ کی امامتِ نبوت عظیم المرتبت ہے یہ نہیں کہ باقی انبیا امام اور پیشوا نہیں تھے۔

(ز) بحوالہ حدیث منزلتِ ہارونؑ

غزوہ تبوک کے موقع پر رسول اکرم ﷺ نے حضرت علیؓ سے فرمایا تھا کیا تو اس بات پر راضی نہیں کہ میری نسبت سے تیرا درجہ وہی ہو جو ہارون کا حضرت موسیٰ علیہ السلام سے تھا (جبکہ کوہ طور پر جاتے ہوئے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں قوم پر نگراں مقرر کیا تھا) لیکن میرے بعد کوئی نبی نہیں''۔ اس سے حضرت علیؓ کی خلافت بلافصل پر استدلال درست نہیں۔ حضرت ہارون علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے جانشین حضرت موسیٰؑ کی زندگی ہی میں ہوئے تھے اس طرح سیدنا حضرت علیؓ رسول اکرم ﷺ کی حیات طیبہ میں ہی اہل بیت کی خواتین اور بچوں پر نگہبان مقرر ہوئے تھے۔ ورنہ سوچا جائے کہ اللہ نے آیت استخلاف میں ایمان اور اعمال صالحہ کی نعمت سے مالا مال مومنین سے خلافتِ ارضی کا وعدہ فرمایا تھا ان مومنین میں بالاتفاق حضرت علیؓ بھی داخل ہیں تو اگر ان سے مطلق خلافت کی بجائے خلافت بلافصل کا وعدہ ہوتا تو یقیناً پورا ہوتا درمیان میں اصحابِ ثلاثہ ہرگز نہیں آسکتے تھے۔ نیز اندریں سلسلہ خلفائے راشدین کے عنوان کے تحت دیئے گئے آخری ذیلی عنوان میں تشقیق جدلی کے حوالے سے جو نہایت اہم بحث کی گئی ہے۔ اس پر مزید غور کیا جائے جس سے ثابت ہوجاتا ہے کہ قرآن وسنت سے حضرت علیؓ کی خلافت بلافصل ثابت کرنا ایسا تکلف ہے جو لاینحل اشکالات کو جنم دیتا ہے لہذا ایسا استدلال ہی درست نہیں۔

حوالہ جات

(۱) القرآن الکریم:- التوبہ، ۳۹
(۲) القرآن الکریم:- التوبۃ، ۴۰
(۳) القرآن الکریم:- البقرہ، ۲۵۳
(۴) القرآن الکریم:- الحدید، ۱۹
(۵) القرآن الکریم:- الحدید، ۴
(۶) القرآن الکریم:- النساء، ۱۰۸
(۷) القرآن الکریم:- النحل، ۱۲۸
(۸) القرآن الکریم:- الاعراف، ۵۶
(۹) القرآن الکریم:- الحجر، ۹
(۱۰) القرآن الکریم:- ال عمران، ۱۱۹
(۱۱) القرآن الکریم:- الشعراء، ۶۱
(۱۲) القرآن الکریم:- الشعراء، ۶۲

(۱۳) القرآن الکریم:- طٰہٰ، ۳۶
(۱۴) القرآن الکریم:- طٰہٰ، ۴۵
(۱۵) القرآن الکریم:- طٰہٰ، ۹۴
(۱۶) القرآن الکریم:- القصص، ۱۸
(۱۷) القرآن الکریم:- القصص، ۲۵
(۱۸) القرآن الکریم:- القصص، ۳۱
(۱۹) القرآن الکریم:- القصص، ۳۳
(۲۰) القرآن الکریم:- طٰہٰ، ۴۵
(۲۱) القرآن الکریم:- طٰہٰ، ۶۷
(۲۲) القرآن الکریم:- یوسف، ۱۳
(۲۳) القرآن الکریم:- الانعام، ۳۳
(۲۴) القرآن الکریم:- یونس، ۶۲
(۲۵) القرآن الکریم:- مریم، ۲۴۔۲۶
(۲۶) القرآن الکریم:- القصص، ۷
(۲۷) القرآن الکریم:- النحل، ۱۲۷
(۲۸) القرآن الکریم:- العنکبوت، ۳۳
(۲۹) القرآن الکریم:- ال عمران، ۱۳۹
(۳۰) القرآن الکریم:- حم سجدہ، ۳۰
(۳۱) القرآن الکریم:- النحل، ۱۲۷
(۳۲) القرآن الکریم:- المائدہ، ۶
(۳۳) القرآن الکریم:- الحج۔۳۹، ۴۰
(۳۴) القرآن الکریم:- الحج، ۴۱
(۳۵) تفسیر منہج الصادقین۔ ۶/۱۷۷
تفسیر منہج الصادقین۔ از ملا فتح اللہ کاشانی
(۳۶) فروع کافی۔ کتاب الجہاد، ۱۹۔۱۳/۵
(۳۷) القرآن الکریم۔ المائدہ، ۵۴
(۳۸) نہج البلاغۃ طبع عصر۔ ۲/۱۱۸
(۳۹) البدایۃ والنہایۃ دار الحدیث قاہرہ۔
طبع ۱۹۹۲/۶۔۲۳۶۔۲۳۴/۷
(۴۰) تفسیر منہج الصادقین ملا فتح اللہ کاشانی،
۳/۲۴۸۔۲۴۹
(۴۱) صحیح بخاری۔ ۱/۴۹۰
(۴۲) فتح الباری۔ شرح بخاری ۱۱/۳۸۵۔
کتاب الرقاق باب الحشر
(۴۳) القرآن الکریم:- الفتح، ۱۶
(۴۴) القرآن الکریم:- الفتح، ۱۵
(۴۵) القرآن الکریم:- الفتح، ۱۴
(۴۶) القرآن الکریم:- النور، ۵۵
(۴۷/۱) القرآن الکریم:- یونس، ۴۶
(۴۷/۲) القرآن الکریم:- الزخرف، ۱۲
(۴۸) القرآن الکریم:- الحشر، ۲
(۴۹) تفسیر منہج الصادقین:۔ ۶/۳۳۵
(۵۰) تفسیر مجمع البیان۔ ابو علی طبرسی۔
سورہ نور۔ آیت استخلاف
(۵۱) المیزان فی تفسیر القرآن۔ محمد حسین طباطبائی
سورۂ نور آیت استخلاف ۔صفحہ، ۱۵۳
(۵۲) نہج البلاغۃ طبع مصر۔ ۲۷۱
(۵۳) شرح نہج البلاغۃ ابن میثم بحرانی

(۵۴) القرآن الکریم:- الفتح، ۱۹۔۲۳
(۵۵) القرآن الکریم:- النساء، ۱۵۱
(۵۶) القرآن الکریم:- النمل، ۶۵
(۵۷) القرآن الکریم:- المائدہ، ۵۵
(۵۸) القرآن الکریم:- البقرہ، ۴۳
(۵۹) القرآن الکریم:- المومنون، ۲
(۶۰) القرآن الکریم:- البقرہ، ۲۳۸
(۶۱/۱) توضیح المسائل امام خمینی۔ مسائل نماز
(۶۱/۲) توضیح المسائل امام خمینی۔ مسائل نماز
(۶۲) تفسیر ابن کثیر۔ سورۂ مائدہ آیت ولایت ۲/۷۱
(۶۳) تفسیر کبیر امام رازیؒ۔ سورۂ مائدہ
آیت ولایت ۲/۷۱
(۶۴/۱) اصول کافی۔ صفحہ، ۱۷۸
(۶۴/۲) تفسیر صافی، محسن کاشی۔ ۲/۴۵۲
(۶۵) تفسیر منہج الصادقین ۳/۲۵۸
(۶۶) مناقب شہر بن آشوب۔ جلد سوم صفحہ ۴
(۶۷) مجمع البحرین ومطلع النیرین۔ صفحہ ۹۲ حاشیہ
(۶۸) اصول کافی۔ صفحہ ۱۷۷
(۶۹) تفسیر صافی۔ ۲/۴۵۰
(۷۰) مسلم وابوداؤد بحوالہ جمع الفوائد۔ ۱/۳۰، رقم ۲۰۹۸
(۷۱) اصول کافی طبع لکھنو۔ صفحہ، ۴۸۷
(۷۲) اصول کافی۔ صفحہ، ۱۷۸
(۷۳) القرآن الکریم:- الحج ۳۹، ۴۰
(۷۴) القرآن الکریم:- الحشر، ۸
(۷۵) القرآن الکریم:- الانفال، ۷۴
(۷۶) القرآن الکریم:- البقرہ، ۴
(۷۷) احتجاج طبرسی۔ طبع نجف اشرف، صفحہ ۱۳۵
(۷۸) شرح تجرید۔ طبع قم صفحہ، ۲۳۰
(۷۹) لضب الرائیۃ۔ حافظ زیلعیؒ ۱/۳۶۰
(۸۰) البلاغ المبین۔ حصہ اول سوم۔
آغا سلطان محمد مرزا دہلوی۔ مکتبہ عمر اینہ ٹیوشالا مارٹاؤن لاہور طبع ۱۹۵۷، ص ۵۶۲
(۸۱) البلاغ المبین۔ صفحہ ۵۵۱، ۵۵۰
(۸۲) البلاغ المبین۔ صفحہ، ۵۴۹
(۸۳/۱) حق الیقین فارسی، مطبوعہ ایران۔
ملا باقر مجلسی۔ صفحہ ۱۰۴، ۱۰۶
(۸۳/۲) القرآن الکریم:- النساء، ۱۶۵
(۸۴) اساس الاصول۔ علامہ دلدار علی شیعی صفحہ، ۵۱
(۸۵) مختصر بصائر الدرجات۔ صفحہ، ۹۴
(۸۶) اساس الاصول علامہ دلدار علی۔ صفحہ، ۶۵
(۸۷) اساس الاصول علامہ دلدار علی۔ صفحہ، ۱۰۴
(۸۸) فرائد الاصول شیخ مرتضیٰ شیعی۔ صفحہ، ۸۶
(۸۹) القرآن الکریم:- التحریم، ۱
(۹۰) القرآن الکریم:- التوبۃ، ۳۱
(۹۱) القرآن الکریم:- الفرقان، ۷۴
(۹۲) القرآن الکریم:- النساء، ۵۹
(۹۳) فصل الخطاب علامہ نوری طبرسی شیعی۔ صفحہ، ۳۳۹
(۹۴) فصل الخطاب علامہ نوری طبرسی شیعی صفحہ، ۲۲۷
(۹۵) مجموعہ قوانین اسلام جسٹس تنزیل الرحمٰن۔
ادارہ تحقیقات اسلامی، جامعہ اسلامیہ عالمیہ اسلام آباد۔ جلد اول۔ صفحہ، ۳۵
(۹۶) القرآن الکریم:- الواقعہ، ۱۳، ۱۴
(۹۷/۱) القرآن الکریم:- الواقعہ، ۳۹، ۴۰
(۹۷/۲) القرآن الکریم:- سبا، ۱۳
(۹۸) القرآن الکریم:- یوسف، ۱۰۶
(۹۹) تذکرہ الخواص الائمۃ۔ سبط ابن جوزی۔
طبع نجف اشرف۔ صفحہ، ۳۸۰

(۱۰۰) ینابیع المودۃ شیخ سلیمان قندوزی۔
طبع دوم بیروت ۱۳۹۱ ہجری۔ صفحہ ۱۳۸
(۱۰۱/۱) ینابیع المودۃ شیخ سلیمان قندوزی۔
باب ۱۳ بحث ثالث
(۱۰۱/۲) صحیح مسلم۔ ۲۷۹ (فضائل علی)
(۱۰۱/۳) منہاج السنۃ ابن تیمیہ۔ جلد سوم صفحہ ۱۰۔
تحفہ اثنا عشریہ۔ شاہ عبدالعزیز دہلوی۔
بحث امامت حدیث۔ ہفتم
(۱۰۲) القرآن الکریم:- النساء، ۱۱۵
(۱۰۳) القرآن الکریم:- النساء، ۸۰
(۱۰۴) ترمذی بحوالہ جمع الفوائد جلد اول۔
صفحہ ۳۰، حدیث نمبر ۱۵۵
(۱۰۵) نہج البلاغۃ۔ ۱۱۸/۲
(۱۰۶) السیف المسلول قاضی ثناء اللہ پانی پتی۔
صفحہ ۴۳، اردو ترجمہ محمد رفیق اثری التواب اکیڈمی،
بیروں بوہڑ گیٹ ملتان
(۱۰۷) السیف المسلول قاضی ثناء اللہ پانی پتی۔ صفحہ ۴۴
(۱۰۸) القرآن الکریم:- ہود، ۴۶
(۱۰۹) القرآن الکریم:- الطور، ۲۱
(۱۱۰) القرآن الکریم:- ال عمران، ۶۱
(۱۱۱) القرآن الکریم:- المزمل، ۲۰
(۱۱۲) القرآن الکریم:- الحشر، ۲
(۱۱۳) القرآن الکریم:- الزخرف، ۱۲
(۱۱۴) تفسیر مجمع البیان۔ ابوعلی طبرسی شیعی۔ تفسیر
آیت استخلاف۔ سورہ نور اور واقعہ خندق۔ صفحہ ۳۴۱
(۱۱۵) المیزان فی تفسیر القرآن طباطبائی، ۲۹۳/۱۱
(۱۱۶) تفسیر منہج الصادقین کاشانی، ۲۸۹/۷
(۱۱۷) روضۂ کافی یعقوب کلینی شیعی، صفحہ ۱۸۲
(۱۱۸) حیات القلوب فارسی ملا باقر مجلسی شیعی، ۲۱۹/۲
(۱۱۹) روضۂ کافی، ۳۲۵/۸
(۱۲۰) تفسیر روح المعانی علامہ آلوسی بغدادی، ۴۰۶/۱
(۱۲۱) القرآن الکریم:- الشوریٰ، ۲۳
(۱۲۲) القرآن الکریم:- التوبۃ، ۷۱
(۱۲۳) القرآن الکریم:- ہود، ۲۹
(۱۲۴/۱) القرآن الکریم:- الانعام، ۹۰
(۲۴/۲)
(۱۲۵) القرآن الکریم:- الاحزاب، ۳۳
(۱۲۶) القرآن الکریم:- اعمران، ۱۲۲
(۱۲۷) القرآن الکریم:- ال عمران، ۱۵۵
(۱۲۸) القرآن الکریم:- ال عمران، ۱۵۵۔۱۵۲
(۱۲۹) القرآن الکریم:- آل عمران، ۱۵۹
(۱۳۰) القرآن الکریم:- التوبہ، ۲۵
(۱۳۱) القرآن الکریم:- ھود، ۱۳۱
(۱۳۲) القرآن الکریم:- طٰہٰ، ۱۰
(۱۳۳) القرآن الکریم:- المائدہ، ۶
(۱۳۴) القرآن الکریم:- الانفال، ۱۱
(۱۳۵) القرآن الکریم:- التوبہ، ۱۰۳
(۱۳۶) القرآن الکریم:- الحجرات، ۷
(۱۳۷) القرآن الکریم:- البقرہ، ۱۲۹
(۱۳۸) القرآن الکریم:- التحریم، ۸
(۱۳۹) القرآن الکریم:- البقرہ، ۲۸۶
(۱۴۰) مشکوٰۃ المصابیح، ۳۲۴/۲
(۱۴۱) القرآن الکریم:- الفرقان، ۷۴
(۱۴۲) القرآن الکریم:- ہود، ۱۱۳
(۱۴۳) القرآن الکریم:- المائدہ، ۸

(۱۴۴) القرآن الکریم:- النساء، ۵۹
(۱۴۵) القرآن الکریم:- ال عمران، ۱۷۹
(۱۴۶) القرآن الکریم:- الجن، ۲۶،۲۷
(۱۴۷) القرآن الکریم:- المائدہ، ۱۱۷
(۱۴۸) القرآن الکریم:- یونس، ۹۴
(۱۴۹) القرآن الکریم:- البقرۃ، ۱۲۴
(۱۵۰) القرآن الکریم:- التوبۃ، ۱۲۰
(۱۵۱) القرآن الکریم:- القصص، ۴۱
(۱۵۲) القرآن الکریم:- الفرقان، ۷۴
(۱۵۳) القرآن الکریم:- الانبیاء۔ ۷۳
(۱۵۴) القرآن الکریم:- السجدہ۔ ۲۴

امامیہ کتب کے چند حوالہ جات بعض اہل علم مثلاً مولانا اللہ یار خاں وغیرہ کی بعض تصانیف سے ماخوذ ہیں۔

دینی مدارس

نصاب و نظام اور عصری تقاضے

اپنے موضوع پر انتہائی اہم اور قیمتی دستاویز،

دینی مدارس کے حوالے سے اہلِ علم کے مقالات ومضامین کا ضخیم مجموعہ

مرتب

ڈاکٹر حافظ حقانی میاں قادری

صفحات: ۷۷۵ قیمت: ۲۹۵ روپے

ملنے کا پتہ: فضلی بک سپر مارکیٹ، اردو بازار، کراچی۔